Regd. L. No.7243 Phone: 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

دسمبر 1980

اس پرچہ میں ہے

کیا قائد اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور ۱۱

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ ۳ تین روپے	ٹیلی فون ۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	بدلِ اشتراک سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک ..... ۴ پونڈ
شمارہ ۱۲	دسمبر ۱۹۸۰ء	جلد ۳۳

فہرست

۱۔ لمعات ..... (چند اہم حقائق جن سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیئے) ۲
۲۔ رابطۂ باہمی ------ (۱) گوجرانوالہ ---- (۲) ٹورنٹو (کینیڈا) ---- ۷
۳۔ قرآنی درس کے اعلانات ---------- ۸
۴۔ (سابق گورنر جنرل) ملک غلام محمد (مرحوم) اور طلوعِ اسلام ---------- ۹
۵۔ حقائق و عبر ۔ د باسبہ اہلِ اسلام ---------- ۱۷
۶۔ عائلی قوانین (MUSLIM FAMILY LAWS) ---------- ۲۵
۷۔ کیا قائدِ اعظمؒ، پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟ ---------- ۴۱

(۰)

ایڈیٹر محمد خلیل ۔ ناشر سراج الحق ۔ مقامِ اشاعت ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ۔ مطبوعہ ۔ اشرف پرنٹنگ پریس ۹ ایبک روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

(چند اہم حقائق جن سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیئے)

صدرِ مملکت نے ماہ اکتوبر میں منعقدہ خواتین کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

> جائے تاسف ہے کہ وہ مذہب جو اتحاد اور تنظیم کے لئے بہت بڑی قوت ہے، اسے بعض لوگ، فرقہ داری اور اختلافات کو ہوا دینے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔
>
> ("دی مسلم" - ۲۹ ؍ ۱۰ ؍ ۸۰)

صاحبِ صدر نے اپنی تقریر میں (انگریزی زبان کے) تین الفاظ استعمال کئے ہیں۔ (SECTARIANISM)، (COMMUNALISM) اور (DIFFERENCES)۔ "سیکٹیرین ازم" سے مراد وہ اختلاف ہوتا ہے جو کسی ایک مذہب کے مختلف فرقوں میں ہو۔ ہم نے اس کا ترجمہ فرقہ داری کیا ہے۔ کمیونلزم سے مراد وہ اختلافات ہوتے ہیں جو ایک ملک میں بسنے والے مختلف مذاہب کے پیروؤں میں ہوں۔ یہ چیز (مثلاً) بھارت میں ہے۔ ہمارے ہاں نہیں۔ ہمارے ہاں "فرقہ داری" اور اس سے پیدا ہونے والے اختلافات ہیں — ان اختلافات کو ہوا دینا یا ان کی بنا پر اشتعال انگیزی کرنا، بڑی مذموم حرکت اور جرم ہے۔ اس لئے اس کے خلاف ہر بہی خواہِ پاکستان کو آواز بلند کرنی چاہیئے۔ لیکن جہاں تک اختلافات کا تعلق ہے، جب تک فرقے موجود ہیں، یہ مٹ نہیں سکتے۔ اختلافات تو فرقوں کی بنیاد میں مضمر ہوتے ہیں۔ دنیا کا کونسا مذہب ہے جس میں فرقہ دارانہ اختلافات موجود نہیں۔ اور چونکہ اسلام بھی ایک مذہب بن چکا ہے اس لئے اس میں بھی فرقہ دارانہ اختلافات ناگزیر ہیں۔ انہیں مٹانے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ (بجز اس کے کہ یہ مذہب پھر سے دین کی شکل اختیار کرلے، جو بظاہر ناممکن دکھائی دیتا ہے) دین، اس کتاب میں ہوتا ہے جو خدا کی طرف سے ملی ہو اور مذہب انسانوں کا وضع کردہ مسلک ہوتا ہے، خواہ ان کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ مذہب کے مختلف فرقوں میں اتحاد پیدا کیا جا سکتا ہے، وحدت نہیں پیدا کی جا سکتی۔ اتحاد کے معنی ہوتے ہیں، مختلف جماعتوں، گروہوں، پارٹیوں، فرقوں کا اپنا اپنا جداگانہ تشخص قائم رکھتے ہوئے، کسی خاص مقصد کے حصول کے لئے متفق ہو جانا۔ اس قسم کے اتحاد کی مثال، ۱۹۷۷ء کی تحریک کے سلسلہ میں "متحدہ محاذ" کی شکل میں سامنے آئی تھی۔ اس میں مختلف فرقے، ایک خاص مقصد کے لئے متفق ہوئے تھے لیکن ان کے جداگانہ تشخص بدستور برقرار تھے اور باہمی اختلافات بھی موجود۔ آپ کو یاد ہوگا کہ یہ فرقے متحدہ محاذ کی مجالس میں تو یکجا ہوتے تھے لیکن وہیں جب نماز کا وقت آجاتا تھا تو الگ الگ ٹولیوں میں

بٹ جاتے تھے۔ وہ روزہ افطار کرنے کے لئے تو ایک میز پر اکٹھے بیٹھ جاتے تھے لیکن افطاری کے فوری بعد، اُسی لان (سبزہ زار) میں نمازِ مغرب کی مختلف جماعتیں کھڑی ہو جاتی تھیں۔ یہ چیز نہ اُنہی جماعتوں تک محدود تھی نہ اُنہی واقعات تک۔ یہ فرقہ دارانہ اختلاف کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ اختلافات آج کے نہیں، صدیوں سے اسی طرح چلے آرہے ہیں۔ اگر نماز، روزہ وغیرہ یا پرسنل لاز میں یہ اختلافات نہ ہوں، تو مختلف فرقوں کا وجود ہی نہ رہے۔ ان اختلافات پر نہ تو ان سے ناراض ہونا چاہیئے اور نہ ہی ان کے مٹانے کی کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ ایسی ہر کوشش ناکام رہے گی۔ ان کا تعلق ان کے عقائد سے ہے اور عقائد کسی کے چھڑائے، چھوٹتے نہیں۔ ہماری ہزار سالہ تاریخ اس پر شاہد۔ اس تمام عرصہ میں، مختلف ہمدردانہ ملّت کی طرف سے ان فرقوں میں، یک جہتی پیدا کرنے کے لئے جو کوششیں ہوئی ہیں، وہ اگر کامیاب بھی ہوئی ہیں، تو صرف اتحاد پیدا کرنے کی حد تک۔ مذہب میں ہوتا ہی یہی ہے۔

مذہب کے برعکس دین، (اتحاد کے بجائے) وحدت پیدا کرتا ہے۔ یہ ایسی اُمّت کی تشکیل کرتا ہے جس میں، مختلف افراد اپنے ہر قسم کے اختلاف (رنگ، نسل، زبان، وطن، اور سابقہ مذہبی اختلافات) کو چھوڑ کر، ایک وحدت (UNIT) بن جاتے ہیں۔ یہ بھی عقیدہ کی بنا پر ہوتا ہے جسے ایمان کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ ایمان ہوتا ہے ضابطۂ خداوندی کی صداقت پر جس کے تابع زندگی بسر کرنا یہ اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ یعنی ان میں وجہ جامعیت کتاب اللہ کے ساتھ اعتصام یا تمسک ہوتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا ... (۳/۱۰۳) تم سب کے سب یک جا ہو کر، کتاب اللہ کو تھامے رکھو اور تفرقہ پیدا نہ کرو۔ "یہ وحدت" جسموں کے ایک جگہ اکٹھے ہونے سے پیدا نہیں ہوتی۔ دلوں کے جڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (۳/۱۰۳) "اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا ـــــ بلکہ باہمدگر مدغم کر دیا۔ اور اس طرح تمہیں آپس میں بھائی بھائی بنا دیا۔ یہ اس کا خصوصی انعام تھا۔" یہ اُمّت، اُمّتِ واحدہ تھی۔ اس میں کوئی فرقہ نہیں تھا۔ دین (بلکہ توحید) اور تفرقہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے اسے شرک قرار دیا ہے۔ (۳۰/۳۱-۳۲)۔

کچھ عرصہ کے بعد، اسلام بہ حیثیت دین کے باقی نہ رہا اور اس نے مذہب کی شکل اختیار کر لی۔ دین میں اطاعت صرف ضابطۂ خداوندی (کتاب اللہ) کی تھی جس کا فطری نتیجہ اُمّت کی وحدت تھی۔ اس کے بعد، اُمّت نے مختلف انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت اختیار کر لی اور اس طرح فرقوں میں بٹ گئی۔ وحدتِ اُمّت کی جگہ تفرقہ نے لے لی۔ توحید کی جگہ شرک آگیا۔ دین، مذہب میں بدل گیا۔ اس کے بعد اسلام کہیں نہ رہا۔ فرقوں میں منقسم مسلمان رہ گئے۔ فرقوں کی موجودگی میں اسلامی مملکت کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی مملکت تو ایک طرف، اس صورت میں سرے سے کوئی مملکت ہی قائم نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ مملکت کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس میں بسنے والے تمام افراد، ایک ضابطۂ قوانین کی اطاعت

کریں۔ اور فرقے اپنی اپنی فقہ کی اطاعت کرتے ہیں اس سے مسلمان سلاطین کے لئے مشکل پیدا ہو گئی۔ انہوں نے اس کا حل یہ تلاش کیا کہ مذہب کو مملکت سے الگ کر لیا۔ مذہب کا نام انہوں نے پرسنل لاز رکھ دیا اور مملکت کا پبلک لاز۔ پرسنل لاز کے سلسلہ میں انہوں نے مختلف فرقوں کو اجازت دے دی کہ وہ اپنے اپنے عقیدہ اور مسلک (فقہ) کے مطابق زندگی بسر کریں لیکن پبلک لاز کی اطاعت، بلا تفریق ہر ایک پر لازم ہو گی۔ اس نظام کو دورِ حاضر کی اصطلاح میں، سیکولر سٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہی نظام اس وقت دنیا میں ہر جگہ (مسلم اور غیر مسلم ملکوں میں) رائج ہے۔ مذہب پرست طبقہ اس سے مطمئن ہے کیونکہ مملکت ان کے "مذہب" میں مداخلت نہیں کرتی۔ یہ تمام فرقے سیکولر حد تک باہم متفق ہوتے ہیں اور مذہب میں اپنے اپنے اختلافات پر شدت سے قائم۔ یہ نقشہ زندگی کے ہر گوشے میں نظر آتا ہے۔ اس کی ایک بین مثال دیکھئے۔ آپ شام کے وقت انارکلی بازار میں نکل جائیے (یا اپنے شہر کی کسی کاروباری سڑک پر) اس میں آپ کو مسلمانوں کا ہجوم نظر آئے گا جن میں باہمی اختلاف کی کوئی علامت تک دکھائی نہیں دے گی۔ لیکن عین اس وقت جب مساجد سے اذان کی آواز آئے گی تو یہی ہجوم، مختلف گروہوں میں بٹ کر، الگ الگ مساجد کا رخ کرے گا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد جب یہ پھر سیکولر دنیا (بازار) میں آئیں گے تو ان کے اختلافات مٹ جائیں گے۔

اس سے بین تر ایک اور مثال۔ مملکت پاکستان نے زکوٰۃ کا قانون، اسلامی شریعت کی حیثیت سے نافذ کیا تو اس میں فرقہ وارانہ اختلاف پیدا ہو گیا اور حکومت کے اقدام کے خلاف سخت احتجاج اور مظاہرہ ہوا۔ لیکن انکم ٹیکس کے قانون کے خلاف نہ کوئی احتجاج ہوا، نہ مظاہرہ۔ اسے تمام فرقے بلا حیل و حجت تسلیم کرتے رہے، اور تسلیم کر رہے ہیں۔ یہ اس لئے کہ انکم ٹیکس کا تعلق سیکولر ازم سے ہے اور زکوٰۃ کا تعلق مذہب سے۔

یہ جو ہم نے کہا تھا کہ فرقوں کی موجودگی میں اسلامی مملکت قائم ہی نہیں ہو سکتی تو یہی واقعہ اس کی بھی بین شہادت ہے۔ جب تک زکوٰۃ کا تعلق پرسنل لاز سے تھا، کسی کی طرف سے کسی قسم کی مخالفت نہیں ہوتی تھی۔ جونہی مملکت اسے پرسنل لاز کے زمرہ سے نکال کر، پبلک لاز کے دائرہ میں لائی، فرقہ وارانہ اختلافات ابھر آئے اور انہوں نے اس حد تک شدت اختیار کی کہ مملکت کو اسے پھر سے پرسنل لاز کے دائرے میں داخل کرنا پڑا۔ اگر مملکت اسے مذہبی شکل نہ دیتی اور اسی حساب سے کوئی ایڈیشنل ٹیکس عائد کر دیتی تو کسی فرقہ کو اس پر اعتراض نہ ہوتا۔ زکوٰۃ کے لئے مذہبی قانون اور انکم ٹیکس کے لئے مملکتی قانون۔ یہ سیکولر ازم ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ فرقوں کی موجودگی میں اسلامی مملکت قائم نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجوہات ظاہر ہیں:۔

۱۔ فرقوں کی موجودگی میں آپ کو پرسنل لاز اور پبلک لاز کو الگ الگ رکھنا ہو گا۔ اور اس قسم کی تفریق سیکولر ازم ہے۔

(۲)۔ اگر آپ پبلک لاء میں کسی ایسے قانون کو شامل کریں گے جسے آپ اسلامی کہیں، تو وہ کسی نہ کسی فرقہ کی فقہ پر مبنی ہوگا۔ دوسرے فرقے اس کی مخالفت کریں گے، اس لئے کہ وہ اسے اسلامی تسلیم ہی نہیں کرتے۔ فقہی قوانین، اس خاص فرقہ کے نزدیک اسلامی ہوتے ہیں۔ تمام فرقوں کے نزدیک اسلامی نہیں ہوتے۔ اور جن قوانین کو تمام اُمّت اسلامی تسلیم نہ کرے، انہیں اسلامی کہا ہی نہیں جا سکتا۔

اور تمام اُمّت صرف اُن قوانین کو اسلامی تسلیم کر سکتی ہے جن کے سرچشمہ کو تمام اُمّت اسلامی تسلیم کرے۔ اور وہ خدا کی کتاب کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا۔ فرقوں کی موجودگی میں یہ کیفیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ فرقوں کی موجودگی میں جسے اسلامی تبلیغ، اسلامی نظام، اسلامی معاشرہ، اسلامی خدمت کہا جاتا ہے وہ فرقہ وارانہ اختلاف کی گرہیں مضبوط کرتا ہے۔ قرآن کریم نے مدینہ میں تعمیر ہونے والی جداگانہ مسجد کو کفر سے کیوں تعبیر کیا تھا اور اسے "خدا اور رسول" کے دشمنوں کی پناہ گاہ کیوں قرار دیا تھا؟ اس لئے کہ، قرآن کے الفاظ میں، اس سے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہوتا تھا۔ (تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ - ۹/۱۰۷) دین میں مساجد کی خصوصیت یہ بتائی گئی تھی کہ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (۷۲/۱۸) "مساجد خدا کے لئے مختص ہیں۔ تم انہیں خدا کے سوا کسی کی طرف منسوب نہ کرو۔" یہ شرک ہوگا۔ یہاں ہر مسجد کے باہر جلی حروف میں لکھا ہوتا ہے کہ وہ مسجد کس فرقہ کی ہے۔ اور اس طرح کی مساجد میں نت نئے دن اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ان مساجد کا بڑے فخر اور مسرت سے افتتاح ہوتا ہے اور اسے دین کی خدمت قرار دیا جاتا ہے۔ فرقوں کی موجودگی میں کوئی مسجد بھی خالصتاً اللہ کی طرف منسوب نہیں ہوتی۔

یاد رکھئے! مذہب کا جس قدر فروغ ہوگا، اسلام کا اسی قدر انحطاط ہوگا۔ اور جب کسی ملک میں، مذہب مملکتی حیثیت اختیار کرے گا تو وہاں دین مجہانک بھی نہیں پائے گا۔ اسلام کا احیاء اور دین کا تمکن اُسی مملکت میں ہو سکے گا جہاں فرقوں کا وجود نہ ہو اور ساری کی ساری اُمّت، ایک ضابطہ خداوندی (قرآنِ مجید) کی اطاعت کرے۔

(۰)

جو صورتِ حال مسلمانوں کے کسی ایک ملک میں مذہبی فرقوں کی ہے، وہی کیفیت مسلمانوں کی مختلف مملکتوں کی ہے۔ ان مملکتوں کے مسلمان، اقوامِ مغرب کی طرح، مختلف قوموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اُمّتِ واحدہ نہیں ہیں۔ لہٰذا، اسلام وہاں بھی نہیں۔ اور جس طرح ہر فرقہ اپنا اپنا جداگانہ تشخص قائم رکھنے پر مصر ہے، اسیطرح ہر مملکت اپنی الگ قومیت میں ہی اپنی ہستی کا راز سمجھتی ہے۔ ان مملکتوں میں بھی آپ، اقوامِ مغرب کی طرح، کسی خاص مقصد کے لئے اتحاد تو پیدا کر سکتے ہیں، وحدت نہیں۔ جمال الدین افغانیؒ نے اس کی کوشش کی اور ناکام ہی نہ رہے بلکہ مایوس ہو گئے۔ اقبالؒ بھی ساری عمر اس کا پیغام دیتا رہا لیکن صدا بصحرا۔ اب بھی ان مملکتوں کو کسی ایک مقام پر اکٹھا کرنے کے لئے کانفرنسیں، مذاکرے، سمینار وغیرہ منعقد کئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ اس طرح ان میں وحدت پیدا ہو جائے گی تو وہ اپنے آپ کو دھوکے میں رکھتا ہے۔ اس سے اگر ان میں کسی مقصد کے لئے اتحاد پیدا ہو جائے تو اسے بھی غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ وحدت

تو ایک ضابطۂ حیات کے تابع زندگی بسر کرنے سے پیدا ہوتی اور قائم رہتی ہے۔ لیکن وہ ضابطۂ حیات (کتاب اللہ) ان قوموں میں تبرکاً رکھا جاتا ہے۔ ضابطۂ آئین و قوانین ہر ایک کا الگ الگ ہے۔ ذرا سوچئے کہ اگر یہ مسلمان قومیں کتاب اللہ کو ضابطۂ حیات تسلیم کرتیں تو (مثلاً) جو کچھ اس وقت ایران اور عراق میں ہو رہا ہے، اس کا تصور بھی کیا جا سکتا تھا؟ قرآن کریم میں ہے: وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا (۴/۹۳) "جس نے کسی ایک مومن کو بھی بالارادہ قتل کر دیا تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا۔ اس پر خدا کا غضب اور لعنت ہوگی۔ اور اس کے لئے اس نے عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے"۔ یہ ایک مومن کو بالارادہ قتل کرنے کی سزا ہے۔ اس جنگ میں دونوں طرف مسلمان مملکتیں ہیں، ہر روز سینکڑوں، ہزاروں کی تعداد میں قتل ہوتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جنگ میں قتل بالارادہ ہوتا ہے۔ یہ تو ان دو مملکتوں کی حالت ہے۔ باقی رہی دوسری مملکتیں۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید میں ہے کہ

> اگر کبھی ایسا ہو کہ مومنین کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔ اگر اس کے بعد کوئی فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو اس زیادتی کرنے والے فریق کے خلاف اٹھ کھڑے ہو تا آنکہ وہ اس فیصلہ کی طرف پلٹ آئے جو قانونِ خداوندی کی رُو سے کیا گیا تھا۔ سو اگر وہ لوگ اس فیصلہ کی طرف پلٹ آئیں تو ان میں عدل و انصاف کے مطابق صلح کرا دو۔ اور ہمیشہ انصاف کو ملحوظ رکھو۔ یہ بات قانونِ خداوندی کی رُو سے بڑی مستحسن ہے۔ (۴۹/۹)

آج کہاں ہے وہ اتھارٹی جسے یہ حکم دیا گیا تھا؟ اس قسم کی اتھارٹی کا وجود دین کے نظام ہی میں ممکن ہے جس کی رُو سے تمام اُمت کی ایک مملکت اور اس کی ایک مرکزی اتھارٹی ہوتی ہے جسے جملہ اختیارات اور اقتدارات حاصل ہوتے ہیں۔ سوچئے کہ کیا اس وقت ہماری حالت عام اقوامِ عالم کی سی نہیں؟ ہم میں اور غیر مسلم اقوام میں کیا فرق ہے۔ (بلکہ اکثر امور میں وہ ہم پر فائق ہیں)۔ یہ اس لئے کہ نوّے کروڑ مسلمان، مذہبِ اسلام کے نام لیوا ہیں، دینِ اسلام کے نہیں۔ مذہب کے ساتھ متمسک ہو کر دین کے نتائج کی توقع رکھنا خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے؟ ہم جتنی جلدی اس خود فریبی سے نکل کر حقائق کا سامنا کریں اتنا ہی اچھا ہوگا۔ نوّے کروڑ مسلمان مختلف قومی مملکتوں میں بٹے ہوئے اور ہر مملکت کے باشندے مختلف فرقوں میں منقسم! اور اس پر ہم اس خیالِ خام میں گرفتار کہ یہ انہی حالات اور عقائد کو برقرار رکھتے ہوئے جسدِ واحد بن جائیں گے؟ ؎

این خیال است و محال است و جنون

—— (۰) ——

فہرست معطیانِ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی آئندہ اشاعت میں دی جائے گی۔ (ناظم ادارہ)

رابطۂ باہمی

۱- گوجرانوالہ

گوجرانوالہ میں بزمِ طلوعِ اسلام کے قیام کو تو زیادہ عرصہ نہیں گذرا، لیکن اس کی کارکردگی کی رفتار بڑی خوش آئند اور امید افزا ہے جس کے لئے بزم کے اراکین اور ان کے نمائندہ، چوہدری مقبول شوکت مستحقِ تبریک و تحسین ہیں۔ بزم کی طرف سے ۴ر نومبر ۱۹۷۶ء کو ایک نہایت حسین و سادہ سی تقریب منائی گئی جس کا عنوان تھا — پرویز صاحب کے ساتھ ایک شام — پرویز صاحب درس سے فارغ ہونے کے بعد اپنے چند ایک رفقاء کی معیت میں گوجرانوالہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاں وہ ایک بجے کے قریب پہنچ گئے۔ اراکینِ بزم نے ان کا نہایت پُرخلوص استقبال کیا۔ اور کچھ وقت تک ان کے ساتھ مصروفِ گفتگو رہے۔ اس تقریب میں شرکت کے لئے شہر اور مضافات بلکہ دور دور تک کے منتخب اربابِ علم و بصیرت کو دعوت دی گئی تھی جن کی آمد کا سلسلہ تین بجے سے شروع ہو گیا۔ تقریب کے آغاز سے پہلے شرکاء کی پُرتکلف چائے سے ضیافت کی گئی۔ تلاوتِ قرآن مجید سے تقریب کا آغاز ہوا تو تمام نشستیں بھر چکی تھیں۔ پرویز صاحب نے پہلے مختصر الفاظ میں فکرِ قرآنی کی تحریک کا تعارف کرایا اور اس کے بعد بتایا کہ جس اسلامی مملکت کے قیام کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا اس کے نمایاں خط و خال کیا ہیں اور وہ کس طرح سیکولر سٹیٹ اور تھیاکریٹک سٹیٹ سے متمیز اور ممتاز ہے۔ یہ تقریر باختصار کے باوجود بڑی دلنشین اور بصیرت افروز تھی۔ اس کے بعد زیادہ وقت سامعین کے استفسارات کے لئے دیا گیا۔ گوجرانوالہ بڑا پکا مذہبی شہر ہے اور پرویز صاحب وہاں پہلی مرتبہ تشریف لے گئے تھے، بایں ہمہ استفسارات، بحث و مباحثہ کی سطح سے بلند اور متین اور سنجیدہ تھے۔ پانچ بجے کے قریب یہ نہایت شائستہ، شگفتہ اور مؤثر تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ اس حسنِ کارکردگی کا سہرا اراکینِ بزمِ طلوعِ اسلام، گوجرانوالہ، اور ان کے نمائندہ چوہدری مقبول شوکت کے سر ہے جنہیں ادارہ مبارک باد دیتا ہے۔

—————(۰)—————

۲- کینیڈا

شکرِ ایزدی کہ شمعِ فکرِ قرآنی کی کرنیں دُور دُور تک پھیلتی جا رہی ہیں۔ کینیڈا میں مختلف مقامات پر بہت سے احباب انفرادی طور پر اس فکر سے متاثر اور اس کی اشاعت کے لئے کوشاں تھے لیکن تنظیمی طور پر اس کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ کراچی بزم کے ایک ہونہار رکن شاہد محمود وہاں گئے تو انہوں نے ان منتشر مساعی کی شیرازہ بندی کا آغاز کیا اور بالآخر ٹورنٹو (TORONTO) میں بزم قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کے لئے وہ مستحقِ مبارکباد ہیں۔ اراکینِ بزم نے محترم عمر فاروق اچھا کو (جو اس فکر سے ایک عرصہ سے وابستہ ہیں) اپنا نمائندہ منتخب کر لیا۔ ادارہ طلوعِ اسلام اس بزم کے قیام اور اس کے نمائندہ کے انتخاب کی بمسرّت توثیق کرتا ہوا دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ ان احباب کی ہمتوں میں برکت عطا فرمائے اور فکرِ قرآنی کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں ان کی کوششیں بارآور ہوں۔ ہمیں امید ہے کہ عمر فاروق صاحب اپنی ان ذمہ داریوں کو حسن و خوبی سے انجام دیں گے اور بزم کی کارفرمائی کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جائے گا۔

—————(۰)—————

محترم پرویز صاحب کا

درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام لندن (انگلینڈ)
ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)
149 SUTTON COURT RD.
LONDON E-13 — 9NR.
PHONE 01 — 552-1517

لاہور میں ہر جمعہ ۹½ بجے صبح
۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن)
(فون نمبر 880800)

بزمِ طلوعِ اسلام ٹورنٹو (کینیڈا)
ہر ماہ کے پہلے اتوار کو دس بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
335 DRIFTWOOD AVE. #311 DOWNSVIEW
TORONTO [NORTH YORK] (ONT) M3N-2P3
PHONE [416] 661 — 2827

کراچی ہر جمعہ کو ۹½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ کمرہ نمبر ۲۴ ہارون چیمبرز الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی کراچی ۲۔ فون نمبر ۲۳۸۸۲۸

گوجرانوالہ میں ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام ملحق رہائش گاہ چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ۔ سول لائنز

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) بر مکان۔ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر۔ بالمقابل وی آئی پی مین گیٹ۔ پشاور سٹیڈیم۔ بارہ روڈ (فون ۷۵۱۰۹)

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام بمقام ۱۲/۱/بی بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) بر مکان ڈاکٹر رضا محمد خان۔ نواب علی روڈ

جلال پور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)

راولپنڈی۔
میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
جی ۱۲۶۔ لیاقت روڈ

ملتان میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔ (فون ۳۱۰۷۱)

لیہ (بذریعہ ٹیپ) ہر جمعہ بعد نماز مغرب رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب سرکلر روڈ۔

پنج کسی میں ہر جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بوقت ۳ بجے شام بمقام مطب حکیم احمد الدین صاحب نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام (تحصیل کبیر والا ضلع ملتان)

ایبٹ آباد میں ہر اتوار ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) دفتر غلام مصطفٰے اعوان ایڈووکیٹ

ہنگو میں ہر جمعہ ½۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) بر مکان محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون ۶۷)

سرگودھا میں ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) چوک واٹر سپلائی مکان ۲ "نظامی منزل"

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) حیات سرجری کلینک ۳۲/پی پیپلز کالونی ۱ (فون نمبر 27455)

(باقی بر صفحہ ۲۲)

(سابق گورنر جنرل) ملک غلام محمد (مرحوم) اور طلوعِ اسلام

اواخر اکتوبر اور شروع نومبر ۱۹۸۰ء میں، روزنامہ نوائے وقت (لاہور) میں؛ وارث میر صاحب کا ایک مبسوط مقالہ بالاقساط شائع ہوتا رہا ہے جس میں انہوں نے مختلف (سابقہ) سربراہانِ مملکتِ پاکستان کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا، اور ان کے ابزعم خویش ذمائم و عیوب کو نمایاں کر کے اچھالا ہے۔ سربراہانِ مملکت یا ان کی حکومت کے غلط اقدامات پر تنقید ضروری ہوتی ہے' لیکن وہی تنقید جو ان کے زمانۂ اقتدار میں ان کے روبرو کی جائے۔ اس سے اس کا امکان ہوتا ہے کہ ارباب اقتدار اپنی اصلاح کر لیں یا (کم از کم) قوم اُن خطرات کا تدارک یا ان نقصانات کا ازالہ کر سکے جو ان کی غلط کوششوں سے پیدا ہو رہے ہوں۔ یہی تنقید حق گوئی بھی کہلا سکے گی، ورنہ کسی کی موت کے بعد اس کی لاش کو تو ہر کوئی رگید سکتا ہے۔

ہمیں اس موضوع سے خاص طور پر دلچسپی اس لئے ہوئی کہ مقالہ نگار نے' (سابق گورنر جنرل) ملک غلام محمد (مرحوم) کے خلاف تنقید کے سلسلہ میں طلوعِ اسلام کو بھی ملوث کیا ہے اور نوائے وقت کی ۳ / اور ۴ / نومبر کی اشاعتوں میں اس کے خلاف جی بھر کر بھڑاس نکالی ہے۔ اس جرم کی پاداش میں کہ اس نے مرحوم کے حق میں چند کلمات   کیوں کہے تھے۔ ہمارے نزدیک یہ امر بھی قابلِ اعتراض نہیں۔ کسی کے خلاف تنقید کا حق ہر ایک کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں افسوس اس بات پر ہے کہ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ طلوعِ اسلام نے ملک غلام محمد (مرحوم) کی جو تعریف کی تھی تو اس کی بنیاد کیا تھی۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے طلوعِ اسلام کو خوشامدی کہا ہے اور مفاد پرست۔ ان کے الفاظ ہیں:-

> نثر میں یہ قصیدہ خوانی طویل ہے اور بلاشبہ حکمرانوں کو خبطِ عظمت میں مبتلا کر کے اپنا اُلو سیدھا کرنے والے پیشہ وروں کے لئے یہ "قصیدہ" میگنا کارٹا" کی حیثیت رکھتا ہے۔ (نوائے وقت ۴ / نومبر ۱۹۸۰ء)

بدنصیب قوموں کی ایک علامت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس میں دوسروں کی نیت پر حملہ کئے بغیر تسکین نہیں ہوتی۔ ورنہ بات تو ویسے بھی کی جا سکتی ہے۔

جہاں تک طلوعِ اسلام کے خوشامدی ہونے کا تعلق ہے اس کی ساری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح اس کے فائلوں میں محفوظ ہے۔ جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ اس نے ہر حکومت' اور نہ صرف سربراہانِ مملکت بلکہ دیگر اربابِ اقتدار کے ہر غلط اقدام پر سخت تنقید کی ہے۔ یہ ان اربابِ حل و عقد کی کشادہ نگہی تھی کہ انہوں نے اپنے خلاف تنقید کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور طلوعِ اسلام پر نہ کوئی قدغن عائد کی' نہ اس کے قلم کی آزادی چھینی۔

لیکن طلوعِ اسلام کو بارگاہِ ایزدی سے ایک اور تعلیم بھی ملی ہے اور وہ یہ کہ جہاں کسی کے غلط اقدام پر اس کی سرزنش کرو، اس کے حسنِ عمل کو پسندیدگی کی نگاہ سے بھی دیکھو۔ میزانِ خداوندی میں کسی کے ایک پلڑے میں جہاں شر کا انبار ہو، اس کے نامۂ عمل میں اگر خیر کا ایک ذرہ بھی ہو تو وہ دوسرے پلڑے میں موجود رہے گا۔ طلوعِ اسلام' اسی معیارِ خداوندی

کے مطابق شر کی تنقید و تنقیص کے ساتھ، خیر کی تحسین و تہنیت بھی ضروری سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس اس قسم کی تعلیم کسی اور گوشے سے ملتی ہے کہ جو آپ سے متفق ہوں ان کے شر کو بھی خیر بنا کر پیش کرو، اور جن سے اختلاف ہو، ان کے خیر پر بھی شر کا لیبل لگاؤ۔ آپ کو مودودی مرحوم کا وہ فقرہ تو یاد ہوگا جو انہوں نے صدر ایوب خان (مرحوم) اور محترمہ فاطمہ جناح (مرحومہ) کے انتخابِ صدارت کی مہم کے دوران ارشاد فرمایا تھا کہ

ایوب خاں میں اس کے سوا کوئی خوبی نہیں کہ وہ مرد ہے۔ اور مس فاطمہ جناح میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ وہ عورت ہے۔

سو جنہیں یہ تعلیم ملی ہو، وہ اگر کسی کی جائز ستائش کو بھی خوشامد پر محمول کر لیں تو ان کا کوئی قصور نہیں۔ یہ ذہنیت کا فرق ہے۔

باقی رہا، مفاد پرستی (اُلّو سیدھا کرتے) کا طعن تو ہم جناب وارث میر صاحب کو چیلنج دیتے ہیں کہ وہ اسے ثابت کریں کہ ہم نے ملک غلام محمد (مرحوم) سے کسی شکل میں ایک پائی تک کا بھی مفاد حاصل کیا ہو۔ اُسی زمانے کا ذکر ہے، طلوعِ اسلام پر اس قسم کا الزام (معدوم) جماعت اسلامی کے ایک ممتاز نمائندہ چوہدری غلام محمد (مرحوم)۔ قیم جماعت اسلامی صوبہ سندھ، نے لگایا تھا جس میں کہا تھا کہ "مرکز نے پرویز صاحب کو ایک لاکھ روپے کی امداد دینی منظور کی تھی جس میں سے بیس ہزار روپیہ ادا بھی کر دیا تھا کہ چوہدری محمد علی صاحب نے برسرِ اقتدار آتے ہی بقیہ امداد بند کر دی"۔ ہم نے چوہدری صاحب (مرحوم) کو ۲۱ دسمبر ۱۹۵۵ء کو بصیغۂ رجسٹری لکھ کر کہا کہ وہ اس الزام کو ثابت کریں۔ جب ان کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا تو ہم نے طلوعِ اسلام بابت فروری ۱۹۵۶ء (صفحہ ۲۷) میں اس چٹھی کو شائع کر کے ان سے کہا کہ اس کی تردید یا اثبات کریں۔ انہوں نے زندگی بھر اس کا جواب نہ دیا۔

یہی چیلنج ہم وارث میر صاحب کو بھی دینے کی جرأت کرتے ہیں۔

دوسری طرف کیا ہوتا ہے، اسے ہم آخر میں عرض کریں گے۔ اب آیئے ان واقعات کی طرف جو ہمارے نزدیک ملک غلام محمد (مرحوم) کے لئے وجہِ ستائش قرار پائے تھے۔

مطالبۂ پاکستان کی، مسلمانوں میں سے سب سے زیادہ مخالفت مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد یہی طبقہ ہجوم کر کے پاکستان آ گیا۔ یہاں آ کر انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اور اسلام کا علم ہم ہی رکھتے ہیں، اس لئے اقتدارِ مملکت ہمارے حوالے کرو۔ اس مطالبہ کو وہ ایک تحریک کی شکل میں آگے بڑھاتے چلے گئے۔ یہ وہ تھیا کریسی تھی جو اسلام کے بدیہی طور پر خلاف تھی اور جسے مٹانے کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ نے کھلے الفاظ میں اس کی مخالفت کی تھی اور یہی مخالفت طلوعِ اسلام نے بھی جاری رکھی۔ (گورنر جنرل) غلام محمد (مرحوم) کو بھی اس خطرہ کا احساس تھا اس لئے انہوں نے بھی اس کی مخالفت کی اور چونکہ وہ دبنگ قسم کے آدمی تھے اس لئے انہوں نے یہ مخالفت کھلے بندوں کی۔ (مثلاً) انہوں نے اواخر اگست ۱۹۵۲ء میں ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کراچی کو مخاطب کرتے ہوئے، اپنی تقریر میں کہا:۔

اکثر لوگوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم زندگی کے معاملات میں مذہب کو بہت زیادہ دخیل کر رہے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اسلام ایک جامد مذہب کا نام ہے جو ارتقاء انسانیت کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے

کہ گذشتہ ایک ہزار سال کے عرصہ میں اسلام نے استبداد کے ہاتھوں بڑا نقصان اٹھایا ہے۔ ہوا یہ کہ ان مستبد حکمرانوں نے اسلام کو بطور ایک آلۂ کار کے استعمال کیا۔ مفاد پرست گروہ ان کے ساتھ تھا اور مذہبی پیشوا (علماء) ملوکیت اور مفاد پرستی کے منشاء کے مطابق اسلام کی تاویلات کرتے جاتے تھے اور چونکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہی لوگ مذہب کے واحد ٹھیکیدار ہیں اس لئے جو کچھ یہ کہتے وہی مذہب بن جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جسے ہر شخص خواہ وہ مولوی ہو یا سرکاری دفتر کا ملازم بلا کسی روک ٹوک کے از خود پڑھ سکتا ہے۔ خدا کا احسان ہے کہ ہمارے ہاں ذات پات کی کوئی تمیز نہیں، نہ ہی ہمارے ہاں کوئی پنڈتوں کا گروہ ہے اور نہ ہی اس قسم کا تصور کہ اس گروہ کے باہر باقی لوگ ذہنی طور پر اچھوت ہیں۔ میں اس پلیٹ فارم سے پوری جرأت اور وضاحت کے ساتھ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اسلام زندگی کے ہر شعبہ میں ہمارے اور آپ کے تصور سے کہیں زیادہ مساوات کا حامی ہے۔

اب کرنے کا کام یہ ہے کہ اس ہزار سالہ عرصہ میں اسلام مستبد ملوکیت اور مفاد پرستانہ پیشوائیت کے جس ملبہ کے نیچے دب چکا ہے اسے وہاں سے نکالا جائے۔ جب وہ اسلام سامنے آئے گا تو آپ دیکھیں گے کہ اس کا پیغام کس قدر صاف اور واضح الفاظ میں حریتِ فکر اور تصورِ جمہوریت کے مطابق اور دنیا کے بلند ترین تصورات سے ہم آہنگ ہے۔

لیکن اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہی اسلام صحیح ہے جو آج ہم میں مروج ہے اور جو ہزار سالہ استبداد اور مفاد پرستی کی تخلیق ہے تو میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں اس قسم کی ملوکیت کے استبداد یا پیشوائیت کی خدائی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ ہم حریتِ فکر و نظر کے قائل ہیں اور تمام انسانوں کے لئے زندگی کے ہر شعبہ میں یکساں مواقع بہم پہنچانے کے حامی ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں میں ان بلند اقدار کی روح پھونک دیں جنہیں قرآن پیش کرتا ہے اور جن کے بغیر کوئی قیادت اخلاقی اور روحانی ترقی نہیں کر سکتی۔

(ڈان ۲۹ اگست ۱۹۵۲ء بحوالہ طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۵۳ء)

نیز انہوں نے ۱۷ فروری ۱۹۵۳ء کو ڈھاکہ میں "ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان" کا افتتاح کرتے ہوئے، اس تفصیل کو ان سمٹے ہوئے الفاظ میں دھرایا کہ

اسلام تھیاکریسی کی تعلیم نہیں دیتا۔ نہ ہی اس میں بہیئت یا ملائیت کی کسی شکل میں بھی گنجائش ہے۔ یہ حریتِ فکر کی تعلیم دیتا ہے اور افراد کے حقوق اور واجبات پر زور دیتا ہے۔

(ڈان ۱۲ فروری ۱۹۵۳ء۔ بحوالہ طلوعِ اسلام بابت مارچ ۱۹۵۳ء)

تھیاکریسی کی تحریک، اس کے باوجود بڑھتی چلی گئی۔ ان حضرات کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ ایک طرف ارباب اقتدار کے ذاتی کردار میں کیڑے ڈالے جائیں اور دوسری طرف "اسلام خطرے میں ہے" کے نعرے بلند کر کے عوام کے جذبات کو مشتعل کیا جائے۔ خواجہ ناظم الدین (مرحوم) نیک قسم کے انسان تھے لیکن کٹر مذہب پرست۔ اس لئے ان کے دورِ حکومت میں اس تحریک (تھیاکریسی) کو بڑی تیزی ہوا ملتی گئی جو ۱۹۵۳ء کے فسادات پنجاب پر منتج ہوئی اور جس کی وجہ سے مارشل لاء نافذ کرنا پڑا۔ حالات اس قدر نازک ہو چکے تھے کہ گورنر جنرل کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ خواجہ ناظم الدین وزارت کو برطرف کر دیا جائے۔ چنانچہ ۱۸ اپریل ۱۹۵۳ء کو وہ وزارت ختم کر دی گئی۔ تھیاکریسی کے حامل طبقہ کے نزدیک، ملک غلام محمد (مرحوم) کا یہی جرم کچھ کم سنگین نہیں تھا کہ اس کے بعد انہی فسادات کے سلسلہ میں، مودودی صاحب (مرحوم) کے لئے مارشل لاء کی طرف سے سزائے موت

کے حکم نے ان کے بھڑکائے ہوئے شعلوں پر تیل کا کام دیا۔ (اگرچہ اس حکم کے چھتیس گھنٹے بعد سزائے موت کو قید کی سزا میں بدل دیا گیا تھا، تاہم طلوعِ اسلام نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی کہ اس میں عدل کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو (طلوعِ اسلام بابت جون و جولائی ۱۹۵۳ء)۔

ان واقعات کی بنا پر، تھیاکریسی کے حامل طبقوں کے دل میں ملک غلام محمد (مرحوم) کے خلاف نفرت اور عداوت کے جس قسم کے جذبات ابھر سکتے ہیں، ظاہر ہے۔ لیکن اس کے بعد ایک اور واقعہ نے ان جذبات میں مزید شدت پیدا کر دی۔

پاکستان کی مجلسِ دستور ساز، کہنے کو تو چھ سات سال سے مصروفِ عمل چلی آ رہی تھی لیکن وہ درحقیقت بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ایک ہی مقام پر محوِ گردش تھی اور دستور سازی کے سلسلہ میں کوئی مثبت پیش رفت نہیں ہو رہی تھی۔ یہی نہیں کہ اس سلسلہ میں اس نے کوئی قدم آگے نہیں بڑھایا تھا بلکہ اس کی وجہ سے ملک میں بے حد تشتت و انتشار پیدا ہو رہا تھا چونکہ (قوم کی بدقسمتی سے) اس وقت تک پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب نہیں ہوئی اس لئے لوگوں کو عام طور پر اس کا علم نہیں کہ اس زمانے میں یہ نوزائیدہ مملکت اپنوں کے ہاتھوں کس قدر خطرات میں گھری ہوئی تھی۔ سب سے بڑا خطرہ تو کسی مملکت کا بے آئین رہنا ہے۔ اس کی متعدد وجوہات تھیں۔ سب سے پہلی وجہ تھیاکریسی کے حامیوں کا طرزِ عمل تھا جو اسلام کے نام پر ہر قسم کا انتشار بپا کرتے رہتے تھے۔ آخر الامر انہوں نے عملی تھیاکریسی کا ایک مرحلہ طے بھی کر لیا تھا، یعنی "بنیادی اصولوں کی رپورٹ" میں یہ شق رکھ دی گئی تھی کہ صوبوں اور مرکز کی مجالسِ قانون ساز کے ساتھ ایک علماء بورڈ قائم کیا جائے گا جو اسمبلی میں منظور کردہ ہر قانون کے متعلق فیصلہ کرے گا کہ وہ اسلام کے مطابق ہے یا نہیں۔ یعنی اس طرح قانون سازی کے آخری اختیارات علماء کے ہاتھ میں دے دیئے گئے تھے۔ یہ تھیاکریسی کی عملی شکل تھی۔

دوسری طرف عام لیڈروں کی کیا حالت تھی، اس کے متعلق روزنامہ ڈان نے اپنی ۷ رفروری ۱۹۵۳ء کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا تھا۔

> خود غرضی کی اس لعنت میں پاکستان کے عوام گرفتار نہیں۔ اس میں صرف وہ گنتی کے چند لوگ ماخوذ ہیں جو اپنے آپ کو لیڈر کہتے ہیں۔ ...... وہ وقت دور نہیں جب یہ لیڈر پاکستان کے عوام کو دھوکہ دے جائیں گے۔ انہوں نے اپنے قائد محمد علی جناح کے اس ارشاد کو فراموش کر دیا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ "متحد رہو، یقین محکم رکھو اور اپنے اندر ڈسپلن پیدا کرو"۔ یہ لیڈر مناصب اور مدارج کے پیچھے مارے مارے پھر رہے ہیں اور حصولِ اقتدار کے لئے باہم دگر دست و گریباں ہیں۔ یہی لوگ نچلے درجے کے طبقہ میں خود غرضی، عدم اعتمادی، تفرقہ، بلکہ نفرت کے بدترین جذبات مشتعل کر رہے ہیں۔ (بحوالہ طلوعِ اسلام۔ مارچ ۱۹۵۳ء۔ ص۳)

لیکن سب سے بڑی خرابی اور تھی۔ مجلسِ دستور ساز میں اکثریت مشرقی پاکستان (بنگالیوں) کی تھی جو بالعموم مغربی پاکستان کی ہر نقل و حرکت کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے اور اپنے خلاف سازش سمجھتے تھے۔ قیامت بالائے قیامت یہ کہ ان کی یہ اکثریت وہاں کی ہندو آبادی کے بل بوتے پر تھی اور ہندو، ان کی زندگی کے ہر شعبے میں شریکِ غالب کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہندوؤں کے نمائندے مجلسِ دستور ساز میں بھی شامل تھے۔ ان کا انداز کس قسم کا تھا اور ان کے مقابلہ میں ہمارے (مسلمان) اربابِ حل و عقد کا رویہ کس قدر معذرت خواہانہ اور مبنی بر مرعوبیت تھا، اس کا اندازہ اسمبلی کی اس زمانے کی روئدادوں سے لگ سکتا

ہے۔ (مثلاً) دسمبر ۱۹۵۳ء میں منعقد ہونے والے اسمبلی کے اجلاس میں، ہندو ممبروں کے نمائندہ، مسٹر چٹو پادھیا نے اعتراض کیا تھا کہ

اکثریت پارٹی نے پاکستان کو ایک اسلامی مملکت بنا دیا ہے جس کی وجہ سے غیر مسلم اقلیت کو خطرات پیدا ہو گئے ہیں۔

اس کے جواب میں حزبِ اقتدار کے مسلمان نمائندہ نے (ہم عمداً نام نہیں لینا چاہتے) کہا تھا کہ

ہم نے مملکت کا محض نام اسلامک ری پبلک رکھ چھوڑا ہے۔ اس نام کا آئین پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا۔ پھر مسٹر چٹو پادھیا نے اعتراض کیا تھا کہ مجلس آئین ساز نے فیصلہ کیا ہے کہ رئیس مملکت ہمیشہ مسلمان ہو گا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ رئیس مملکت محض آئینی رئیس ہو گا۔ اس کے اختیارات کچھ نہیں ہوں گے۔ پاکستان ایک آئیڈیالوجیکل اسٹیٹ ہے اور اس کا رئیس (صدر) محض اس آئیڈیالوجی کا نشان۔

مسٹر چٹو پادھیا کا اگلا اعتراض یہ تھا کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہو گا تو اس میں قانون سازی کی گنجائش کہاں ہو گی (اس نے اپنے اعتراض کی تائید میں علماء حضرات کے بیانات پیش کئے تھے جن میں کہا گیا تھا کہ اسلامی مملکت کے تمام قوانین پہلے سے مرتب اور طے شدہ ہوتے ہیں)۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ معترض کا یہ شبہ بھی بے بنیاد ہے۔

قریب ۹۹ فیصد امور ایسے ہیں جنہیں قرآن نے خود انسانوں پر چھوڑ دیا ہے اس لئے اسلامی مملکت میں انسانوں کے قانون سازی کے اختیار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

(ان امور کی تفصیل اور تبصرہ طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۵۳ء کے لمعات میں ملیں گے)۔

یہ تھا مجلسِ دستور ساز کی موجوں کا وہ تلاطم جس میں مملکت پاکستان کا "سفینۂ برگِ گل" ہچکولے کھا رہا تھا۔ حساس قلوب کو ہر آن اس کا دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم (بنگالی۔ ہندو) اکثریت کس وقت ایسا ریزولیشن پاس کر دے جس کی رو سے پاکستان کو بھارت میں مدغم کر دیا جائے یا کنفیڈریشن قائم کر دی جائے۔ یہی وہ خطرات تھے جن کے پیشِ نظر طلوعِ اسلام نے گورنر جنرل (ملک غلام محمد مرحوم) کو مشورہ دیا تھا کہ

> جس جست سے آپ نے ابھی ابھی سب "قصے تمام" کر دیئے ہیں اسی قسم کی "عشق کی ایک جست" کی ابھی اور ضرورت ہے۔ اس وقت تک قانون سازی کے سلسلہ میں جو کچھ ہماری مجلس قانون ساز نے کیا ہے غلط راستوں پر کیا ہے ..... نتیجہ اس کا یہ ہے کہ قرآنی آئین تو خیر بہت دور کی چیز ہے، جو کچھ دوسری قومیں تنہا فکرِ انسانی کی مدد سے مرتب کر لیتی ہیں۔ ہمارے ہاں اتنا بھی نہیں ہو سکا۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ جو کچھ اس وقت تک ہوا ہے اس پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا جائے۔ ملک سے ایسے اربابِ فکر و نظر کو اکٹھا کر لیا جائے جو یہ بتا سکیں کہ دورِ حاضرہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے قرآن کون کون سے اصول دیتا ہے۔ اور ان اصولوں کی روشنی میں فکرِ انسانی کے مطابق اپنا آئین مرتب کر لیا جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس طرح قرآنی اصولوں کی روشنی میں ایک ایسا نظام قائم ہو جائے گا جس کی تلاش میں اس وقت انسانیت ماری ماری پھر رہی ہے۔ اس نظام سے پاکستان کو اقوامِ عالم کی امامت مل سکتی ہے۔ آپ اگر یہ کام کر گئے تو جریدۂ عالم پر آپ کا دوام ثبت ہو جائے گا۔
>
> (طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۵۳ء صفحہ ۱۲؛ جون ۱۹۵۳ء صفحہ ۱؛ نومبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۵)

ملک غلام محمد (مرحوم) نے پوری جراءت رندانہ سے کام لیا اور اکتوبر ۱۹۵۴ء میں مجلسِ دستور ساز کو برخاست کر دیا اور اس طرح مملکت پاکستان کو تباہی سے بچا لیا۔

اور یہ تھا مرحوم کا وہ کارنامہ جس پر طلوعِ اسلام نے ان کی خدمت میں ہدیۂ تحسین وتہنیت پیش کر کے انہیں محافظِ پاکستان کہہ کر پکارا تھا۔ اور یہی تھا مرحوم اور اس کے ساتھ طلوعِ اسلام کا وہ جرم جس کی پاداش میں خیاکرتیک حلقہ کی طرف سے انہیں مستوجب دار ورسن قرار دیا جاتا ہے۔ طلوعِ اسلام نے ان کے اس اقدام کی تحسین کے ساتھ ہی ان کی خدمت میں گزارش کیا تھا کہ

> اب جب کہ قدرت کی طرف سے آپ کو موقعہ مل گیا ہے کہ آپ پاکستان کی تقدیر کو ایک خاص قالب میں ڈھال سکیں، ہمارا پُرخلوص مشورہ ہے کہ آپ گزشتہ تجارب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ مجلسِ آئین ساز میں صرف ایسے افراد آنے پائیں جن کے سینے میں اسلام اور ملت کا درد، جن کی نگاہوں میں قرآنی بصیرت، جن کی فکر بساطِ عالم سے آشنا اور جن کی عمر دعقدہ کشائی ملت کی اہل ہو۔
>
> (طلوعِ اسلام - ۱۴ رمئی ۱۹۵۵ء - صفحہ ۵)

(وارث میر صاحب نے اپنے مضمون میں، طلوعِ اسلام کا اقتباس دیتے ہوئے، ان فقرات کو درج نہیں کیا)۔

لیکن اسمبلی توڑنے کے بعد ملک غلام محمد (مرحوم) ڈکٹیٹر نہیں بن گئے تھے۔ انھوں نے نئی اسمبلی متشکل کرنے کے اقدامات شروع کر دیئے اور اگلے ہی سال (جولائی ۱۹۵۵ء میں) جدید اسمبلی وجود میں آگئی۔ لیکن تھیاکریٹک حلقہ نے اس پر بھی ان کے "جرم" کو معاف نہیں کیا۔ ان کے خلاف پراپیگنڈہ مسلسل جاری رکھا (اور یہ کہتے ہوئے ہمارا سر ندامت سے جھک جاتا ہے کہ اس باب میں وہ اس حد تک ذاتیات پر اتر آئے کہ اس کے تذکرہ سے آج بھی گھن آتی ہے)۔ اس قسم کے نامساعد حالات کا مرحوم کی گرتی ہوئی صحت پر بڑا مضر اثر پڑا جس کی وجہ سے انہیں ستمبر ۱۹۵۵ء میں اپنے منصب سے مستعفی ہونا پڑا۔ ہم نے اس ملی حادثہ پر اظہارِ تاسف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

> ہم محترم غلام محمد صاحب کی کمزوریوں سے بھی واقف ہیں اور ہم میں کون ایسا ہے جس میں کمزوریاں نہیں۔ لیکن قرآن کا فیصلہ یہ ہے، اور اس کی صداقت پر کائنات کا طبیعی قانون شاہد کہ حسنات کی اکثریت، سیئات کے مضر اثرات کو مٹا دیا کرتی ہے۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ محترم غلام محمد نے مملکتِ پاکستان کی بہبود اور ملت کے تحفظ کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کے خوشگوار نتائج، ان کی بعض کمزوریوں کے مضر اثرات پر غالب رہیں گے۔
>
> (طلوعِ اسلام - بابت ۲۴ رستمبر ۱۹۵۵ء - صفحہ ۴)

انہوں نے اس منصب سے علیحدگی کے وقت ملک اور قوم کو جو پیغام دیا تھا، وہ ان کی شخصیت کو نمایاں طور پر سامنے لے آتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا:-

> تمام نوعمر اقوام کو اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں ایسی پُرخطر گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے جو ان کی فنا اور بقا کیلئے فیصلہ کُن مراحل ہوتے ہیں۔ میں اس بات پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ مبداءِ فیض کی کرم گستری نے مجھے ایسے مواقع بہم پہنچائے کہ میں ملتِ پاکستانیہ کا سفینہ ہر گل ان خطرناک گھاٹیوں سے بحسن وخوبی بچا کر لے گیا۔ اگرچہ اس کے لئے بعض اوقات مجھے ایسے اقدامات کرنے پڑے جنہیں سخت گیری سے تعبیر کیا جائے گا۔ میں نے جو کچھ کیا اس کا آخری فیصلہ تو ماضی کی تاریخ ہی دے گی لیکن اس کے چند نتائج جو اس وقت تک برآمد ہو چکے ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں۔ میرا ضمیر پاک اور صاف ہے کہ میں نے جو کچھ کیا اس کا جذبۂ محرکہ قوم اور ملت کی بہبود اور مرفہ الحالی

کے سوا کچھ نہ تھا۔ . . . میرے سامنے ہمیشہ یہی حقیقت رہی کہ ہماری موت اور حیات پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ زندہ ہے تو ہم موت کے چنگل سے آزاد ہیں لیکن اگر یہ نہ رہے تو ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہ سکتا . . . . . ہماری آنے والی نسلوں کا ہم پر یہ تقاضا ہے کہ ہم اس ملک کو ماضی کی روایات کا مظہر اور مستقبل کی شاندار اُمیدوں کا مرکز بنا کر جائیں۔

آپ غلام محمد کے اس الوداعی پیغام کی گہرائیوں میں جا کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے گا کہ یہ چند ڈھلے ہوئے فقرے نہیں جنہیں ایسے مواقع پر مشین کی طرح دہرا دیا جاتا ہے۔ ان الفاظ میں خلوص اور جذبات کی شدت جھلکتی نظر آ رہی ہے۔ اور اس پیغام کا آخری ٹکڑا تو ایسا ہے کہ ممکن نہیں کہ اسے دیانتدارانہ طور پر پڑھا جائے اور اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آجائیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ . . . .

میں جب آپ کو یہ مخلصانہ الوداعی سلام کر رہا ہوں تو میرے قلبِ حزیں کو اس یقین سے بے حد تقویت پہنچ رہی ہے کہ جب میں کائنات کے دن خدا کے تختِ جلال کے سامنے کھڑا ہوں گا تو میں نہایت عجز و انکسار کے ساتھ یہ کہنے کے قابل ہوں گا کہ میں نے کوشش کی کہ اپنی انسانی توانائیوں اور صلاحیتوں کی آخری حد تک اپنے ملک کی خدمت خلوص اور دیانتداری سے کروں۔ (طلوعِ اسلام۔ بابت ۲۴ ستمبر ۱۹۵۵ء)

اس کے بعد جب ستمبر ۱۹۵۶ء میں ان کی وفات ہوئی تو طلوعِ اسلام نے بطورِ تعزیت لکھا تھا کہ

ہمارے اس قحط الرجال میں مرحوم کی ہستی مغتنمات سے تھی۔ وہ اس انداز کے انسانوں کی آخری یادگاروں میں سے تھے جن کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ :-

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے   تنے محکم تر از سنگین حصارے
درونِ او دلِ درد آشنائے   چو جوئے در کنارِ کوہسارے (طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء)

ہم نے یہ الفاظ مرحوم کی وفات کے بعد لکھے تھے۔ ہمیں اُمید ہے کہ وارث میر صاحب اس سے متفق ہوں گے کہ جو تعریف کسی کی وفات کے بعد کی جائے اسے خوشامد نہیں کہا جا سکتا۔ نہ ہی اس سے مقصود جلبِ منفعت ہوتا ہے۔ طلوعِ اسلام کا شیوہ ہمیشہ حق گوئی رہا ہے۔ خوشامد کبھی نہیں رہا۔ جس کسی نے بھی قرآنِ کریم کی تعلیم کے مطابق کچھ کہا اور پاکستان کے تحفظ کے لئے کچھ کیا، طلوعِ اسلام کے دل میں اس کے لئے احترام رہا ہے۔ اگر غلام محمد مرحوم اس زمانے میں اس قسم کی قلندرانہ جرأت سے کام نہ لیتے تو پاکستان یا تو تھیاکریسی کے ہاتھوں تباہ ہو چکا ہوتا اور یا بھارت کے ساتھ مدغم! یہ وجہ تھی جو ہم نے انہیں 'محافظِ پاکستان' کہا تھا۔

اب آئیے تصویر کے دوسرے رُخ کی طرف۔ وارث میر صاحب نے طلوعِ اسلام کا نام ادا کر لیا ہے اور اس کے پچیس تیس سال پہلے کے فائلوں سے اقتباس پر اقتباس دیتے چلے گئے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے لکھا ہے :-

اسلامی نظام کے علمبردار سیاسی و دینی رہنماؤں کے ایک ترجمان نے "محافظِ اسلام" کے الفاظ یحییٰ خان کے لئے بھی استعمال کئے تھے۔ (نوائے وقت۔ ۴ر نومبر ۱۹۸۰ء)

وارث میر صاحب نے نہ تو اسلامی نظام کی علمبردار جماعت کا نام لیا ہے۔ نہ اس کی راہنما کا جس نے یحییٰ خان کے لیے اس قسم کے الفاظ استعمال کئے تھے اور نہ ہی اس جریدہ کا نام جس میں یہ واقعہ شائع ہوا تھا۔ لیکن ہم انہیں ایک واقعہ یاد دلاتے ہیں جس میں یحییٰ خان کے لئے اس سے کہیں زیادہ بلند آہنگ الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔ (کالعدم) جماعت اسلامی کے اس

زمانے کے (قائمقام) امیر میاں طفیل محمد صاحب نے اپنی جماعت کے کارکنوں سے ۸ دسمبر ۱۹۶۹ء کو خطاب کرتے ہوئے یحییٰ خان کے متعلق فرمایا تھا :-

> مجھے قوی اُمید ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت کا جو سلسلہ حضرت علیؓ کی شہادت سے منقطع ہوا تھا اس کی بحالی کا آغاز انشاءاللہ حضرت علیؓ ہی کے عاشقوں میں سے ایک شخص کے ہاتھوں پاکستان کی سرزمین سے ہوگا ۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ یحییٰ خان صاحب کو عزم وہمت اور اس اخلاص کے ساتھ پاکستان میں اسلامی جمہوری نظام بحال کرنے کی توفیق عطا فرمائے جس کا انہوں نے بار بار اپنی تقریر میں ذکر فرمایا ہے ۔ آمین

اور یہ الفاظ شائع ہوئے تھے جماعت اسلامی کے ترجمان ' ایشیا ' کی ۱۴ دسمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت کے صفحہ ۷ ۔ اس کے صلہ میں انہیں کیا ملا تھا ، اس کے متعلق لندن سے شائع ہونے والے ہفتہ وار جریدہ " اخبارِ وطن " نے اپنی اشاعت بابت ۲۶ مئی ۱۹۷۱ء میں لکھا تھا :-

> یحییٰ خان نے (۱۹۷۰ء کے) انتخابات کے لئے چار کروڑ روپے کا خفیہ فنڈ قائم کیا تھا جسے مختلف سیاسی جماعتوں میں تقسیم کیا گیا ۔ اس میں سے (۵۰) لاکھ روپیہ جماعت اسلامی کو دیا گیا ۔

جماعت اسلامی نے اس کی تردید نہیں کی ۔

اور جب یحییٰ خان (مرحوم) اقتدار سے الگ ہو گیا تو جماعت اسلامی کے اسی ترجمان نے " حضرت علیؓ کے اس عاشق اور خلافتِ راشدہ کا احیاء کرنے والے " کے متعلق لکھا تھا :-

> یحییٰ خان کے دور میں اسلام آباد کا ماحول انتہائی پراسرار اور تعیشات سے بھرپور تھا ۔ ایوانِ صدر میں رات گئے تک رقص وسرود اور شراب وکباب کی محفلیں جمی رہتی تھیں ۔ اور لگتا ہے کہ ایسی محفلیں بھی منعقد ہوتی تھیں جنہیں " مقابلۂ حسن " نام دینا زیادہ موزوں ہے ۔ ان محفلوں میں بڑے بڑے سرکاری افسروں کی خوبصورت بیویوں اور لڑکیوں کو خاص طور پر مدعو کیا جاتا تھا ۔ افسرانِ کرام خوب سمجھتے تھے کہ ان محفلوں کا مقصد کیا ہے لیکن وہ اپنی ملازمتوں میں ترقی اور توسیع حاصل کرنے اور دوسری مراعات سے بہرہ مند ہونے کے لئے ان محفلوں میں بیویوں اور لڑکیوں سمیت بخوشی شریک ہوتے تھے ۔ یحییٰ خان کی جس پر نظرِ التفات پڑ جاتی گویا اس کے دن پھر جاتے تھے ۔
>
> (ایشیاء ۱۲ مارچ ۱۹۷۲ء)

ہمیں اُمید ہے کہ اس سے وارث میر صاحب کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہوگی کہ " خوشامد " کسے کہتے ہیں ۔ قصیدہ خوانی کے صلہ میں " الو سیدھا کرنے " کا مفہوم کیا ہے ' اور وہ سیاسی اور دینی جماعت کون سی تھی جس کے امراء نے یحییٰ خان کی شان میں یہ قصیدہ خوانی کی تھی !

خط وکتابت کرتے وقت خیال رکھیئے

آجکل ڈاک کے جو لفافے ملتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب لفافہ بند کیا جائے تو اس کے اندر ملفوف خط لفافے کے ساتھ چپک جاتا ہے اور لفافہ کھولتے وقت بڑی دقت ہوتی ہے اور اکثر اوقات خط پھٹ جاتا ہے ۔ ادارہ کے نام خط بھیجتے وقت خیال رکھیئے کہ خط کا کاغذ لفافے کے ساتھ چپکنے نہ پائے ۔ شکریہ !

حقائق و عبر

۱۔ عورت کی حیثیت

ہمارا قدامت پرست طبقہ آجکل عجیب کش مکش، بلکہ ضیق میں مبتلا ہے۔ زمانے کے تقاضے اس شدت سے ابھر اور پھیل رہے ہیں کہ ان کا اعتراف کئے بغیر بن نہیں پڑتی۔ دوسری طرف یہ تقاضے ان کے عقائد اور مسلک کے خلاف جاتے ہیں، اور ان عقائد کو چھوڑ بھی نہیں سکتے۔

غرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را بلائے صحبتِ لیلےٰ و فرقتِ لیلےٰ

اس کی تازہ مثال عورت کی حیثیت کے سوال پر سہارے سامنے آئی ہے۔ لاہور سے جماعتِ اہلحدیث کا ترجمان، ہفت روزہ "اہلحدیث" شائع ہوتا ہے۔ اس کی ۱۴ نومبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں "عائلی قوانین" کے خلاف اداریہ کی قسط اوّل شائع ہوئی ہے۔ اس میں پہلے، زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر، لکھا گیا ہے کہ اسلام نے عورت کو کس قدر بلند مقام عطا کیا ہے۔ تحریر ہے:۔

> اسلام نے اپنے اصلاحی پروگرام میں جہاں دوسرے سینکڑوں مفاسد پر توجہ فرمائی، وہاں اس مظلوم طبقہ (یعنی عورتوں) کو بھی اپنے لطف و کرم سے نوازا اور اس پس ماندہ صنف کا مقام اس قدر بلند و بالا کیا کہ مرد کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کیا۔

اسی رَو میں تین چار کالم لکھنے کے بعد، کہا ہے کہ "قرآن مجید نے ایک ایسا اصول بیان کیا ہے جس سے گھریلو سکون میسّر آتا ہے" اور وہ اصول ہے: اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ.... (۴/۳۴)

"اہلِ حدیث" نے آیت کا اتنا ٹکڑا ہی نقل کیا ہے اور اس کا ترجمہ دیئے بغیر آگے بڑھ گئے ہیں۔ پوری آیت اور اس کا وہ ترجمہ جو ان حضرات کے ہاں مروّج ہے، حسبِ ذیل ہے:۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۭ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۝ (۴/۳۴)

شاہ رفیع الدینؒ (جن کا ترجمہ مستند سمجھا جاتا ہے) اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

مرد حاکم ہیں اوپر عورتوں کے بہ سبب اس کے کہ بزرگی دی اللہ نے بعضے ان کے کو اوپر بعض کے۔ اور بہ سبب اس کے کہ خرچ کرتے ہیں مالوں اپنے سے۔ پس نیک بخت عورتیں فرمانبردار ہیں۔ نگہبانی کرنے والی ہیں بیچ غائب کے ساتھ محافظت اللہ کے۔ اور جو عورتیں کہ تم ڈرتے ہو چڑھائی ان کی سے۔ پس نصیحت کرو ان کو، اور چھوڑ دو ان کو بیچ خواب گاہ کے۔ اور مارو ان کو۔ پس اگر کہا مانیں تمہارا پس مت ڈھونڈھو ان کے راہ۔ تحقیق اللہ ہے بلند بڑا۔

اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ "اہل حدیث" کو پوری آیت درج کرنے، اور جتنی درج کی ہے اس کا بھی ترجمہ دینے کی ہمت کیوں نہیں پڑی یہ کہہ دینے سے کہ "مرد حاکم ہیں اوپر عورتوں کے"۔ مرد اور عورت کی اس مساوات کی ساری عمارت بنیاد سے نیچے آگرتی ہے جسے اہل حدیث نے اس طمطراق سے پیش کیا تھا۔

یہ تو رہی ترجمہ کی بات۔ اب اس آیت کی تفسیر کی طرف آیئے جو احادیث پر مبنی ہے۔ تفسیر ابن کثیر بڑی مستند تفسیر تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا محمد جوناگڑھی (مرحوم) نے کیا تھا جن کا شمار اہل حدیث کے جید علماء میں ہوتا ہے۔ اس میں لکھا ہے :۔

صحیح حدیث میں ہے عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور سب سے بلند پسلی سب سے زیادہ ٹیڑھی ہے۔ پس تو اگر اسے سیدھی کرنے کی کوشش کرے گا تو تو اسے توڑ دے گا۔ اور اگر اس میں کچھ باقی چھوڑتے ہوئے فائدہ اٹھانا چاہے گا تو بے شک فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

(پارہ چہارم ۔ صفحہ ۲۶)

اس کے بعد آپ مندرجہ بالا آیت کی تفسیر ملاحظہ فرمایئے :۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ عورتوں کو مردوں کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک عورت نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے اسے تھپڑ مارا ہے۔ پس آپ نے اسے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا جو یہ آیت اتری، اور بدلہ نہ دلوایا گیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک انصاری اپنی بیوی صاحبہ کو لئے ہوئے حاضر خدمت ہوئے۔ اس عورت نے حضورؐ سے کہا کہ یا رسول اللہؐ! میرے اس خاوند نے مجھے تھپڑ مارا، جس کا نشان اب تک میرے چہرے پر موجود ہے۔ آپؐ نے فرمایا اسے حق نہ تھا۔ وہیں یہ آیت اتری کہ ادب سکھانے کے لئے مرد عورتوں پر حاکم ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اور چاہا تھا اللہ نے اور چاہا۔ (صفحہ ۲)

۱؎ آیت کے صحیح ترجمہ اور مفہوم کے لئے پرویز صاحب کی مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۶۰–۲۶ دیکھئے۔

آگے بڑھنے سے پیشتر، ذرا دل تھام کر سوچیئے کہ اس فقرہ کی زد کہاں جا کر پڑتی ہے۔ یعنی (اس روایت کی رُو سے) ..... حضورؐ نے فرمایا یہ کہ میں تو چاہتا تھا کہ عورتوں کو بدلہ لینے کا حق مل جائے لیکن جب خدا ہی نہ چاہے تو میں کیا کروں؟ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اسی تفسیر میں آگے چل کر لکھا گیا ہے کہ

ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ لونڈیوں[1] کو مارو نہیں۔ اس کے بعد ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ آئے اور عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! عورتیں آپ کے اس حکم کو سن کر اپنے مردوں پر دلیر ہو گئی ہیں۔ اس پر حضورؐ نے انہیں مارنے کی اجازت دے دی۔ اب مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑ مار پیٹ شروع ہوئی اور بہت سی عورتیں شکایتیں لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ سنو! میرے پاس عورتوں کی فریاد پہنچی ہے۔ یاد رکھو! تم میں سے جو اپنی عورتوں کو زدوکوب کرتے ہیں وہ اچھے آدمی نہیں۔ حضرت اشعثؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت فاروقِ اعظمؓ کا مہمان ہوا۔ اتفاقاً اس روز میاں بیوی میں کچھ ناچاقی ہو گئی۔ اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی صاحبہ کو مارا۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے اشعثؓ! تین باتیں یاد رکھو! جو میں نے آنحضرتؐ سے سن کر یاد کر رکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرد سے یہ نہ پوچھا جائے کہ اس نے اپنی عورت کو کس بنا پہ مارا ہے، دوسری یہ کہ وتر پڑھے بغیر سو نا مت اور تیسری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی۔ (ص ۲۱-۲۰)

اسی تفسیر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ

رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ ماسوائے اللہ تعالےٰ کے دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ بخاری شریف میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے بستر پہ بلائے اور وہ انکار کر دے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔ صحیح مسلم میں ہے کہ جس رات کوئی عورت بطور روٹھنے کے اپنے خاوند کے بستر کو چھوڑے رہے تو صبح تک اللہ تعالیٰ کی رحمت کے فرشتے اس پر لعنتیں کرتے رہتے ہیں۔ (ص ۲۱)

یہ تو (ہمارے ہاں کے مروجہ مذہب کی رُو سے) عورت کی حیثیت ہے مردوں کے مقابلہ میں۔ جہاں تک عورتوں کے گناہوں اور برائیوں کے سرچشمہ ہونے کا تعلق ہے اس سے بھی ہماری کتبِ روایات بھری پڑی ہیں۔ مثلاً (احادیث کی صحیح ترین کتاب) بخاری شریف میں کہا گیا ہے کہ

حضرت ابوہریرہؓ مروی ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت کبھی نہ سڑتا اور اگر حوّا نہ ہوتیں تو کوئی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی۔ (بخاری، کتاب پیدائشِ انبیاء)

دوسری روایت ہے:۔

حضورؐ نے فرمایا کہ میرے پیچھے، مردوں پر کوئی فتنہ عورتوں سے زیادہ باعثِ مضرت نہیں (بخاری۔ کتاب النکاح)

---

[1] بات بیویوں کی ہو رہی ہے۔ کیا انہی کو "لونڈیاں" کہہ کر پکارا گیا ہے؟

ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "نحوست تین چیزوں میں ہے۔ عورت، گھر، گھوڑا"
(بخاری، کتاب النکاح)

اسی سلسلہ میں ایک اور روایت ہے کہ
حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے جنت میں دیکھا تو وہاں کی اکثریت فقیروں کی پائی گئی اور دوزخ میں دیکھا تو اکثریت عورتوں کی نظر آئی۔ (بخاری، کتاب الانبیاء)

ہم جویدہ "اہلِ حدیث" سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ آیت (اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ.....) کی تفسیر، جن روایات کی بنا پر کی گئی ہے آپ انہیں صحیح مانتے ہیں یا نہیں۔ اگر صحیح نہیں مانتے تو اس کا اعلان کیجئے کہ وہ روایات وضعی ہیں اور ہم انہیں صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ اور اگر آپ انہیں صحیح مانتے ہیں تو پھر آپ کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ "اسلام نے اس مظلوم طبقہ کو بھی اپنے لطف و کرم سے نوازا اور اس پسماندہ صنف کا مقام اس قدر بلند و بالا کیا کہ مرد کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کیا"۔ آپ جرأت سے اعلان کیجئے کہ ہمارے ہاں عورت کی یہ حیثیت ہے۔ یہ اس سے بہتر ہوگا کہ آپ کلامِ حقیقت سے کام لیں اور لوگوں کو غلط تاثر دینے کی کوشش کریں۔

باقی رہی معاملات میں عورت کی حیثیت، سو اس سلسلہ میں "عائلی قوانین" سے متعلق مقالہ میں کچھ اشارات دیئے گئے ہیں۔ ان سے بھی آپ کے اس دعویٰ کی قلعی کھل جاتی ہے کہ "اسلام نے عورت کو بلند و بالا مقام عطا کیا ہے اور مرد کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کیا ہے"۔ یہ دعویٰ اسی صورت میں سچے ثابت ہو سکتے ہیں کہ آپ دین میں خدا کی کتاب کو آخری سند اور حجت تسلیم کریں۔ وہ بتاتا ہے کہ عورت کا مقام کیا ہے!

(۰)

۲۔ ضروری انتباہ

۲۵ اکتوبر کو ایوانِ کراچی کی طرف سے صدرِ مملکت کو جو استقبالیہ دیا گیا اس میں صدر کے خطاب کی حسبِ ذیل رپورٹ، روزنامہ "ڈی مسلم" (اسلام آباد) بابت ۲۶ اکتوبر میں شائع ہوئی ہے:۔

صدرِ مملکت نے لوگوں کو ان قوم دشمن عناصر سے متنبہ کیا جو یہ کہہ کر کہ قائداعظمؒ سیکولرازم کے قائل تھے، تاریخ کو مسخ کر رہے ہیں۔ انہوں نے بانیٔ پاکستان، قائداعظمؒ کے اقوال کے متعدد اقتباسات پیش کرنے کے بعد کہا کہ اسلام اور پاکستان ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے کیونکہ برصغیر کے مسلمانوں نے اسلام کے نام پر ہی اس کے حصول کے لئے لڑائی لڑی تھی۔ انہوں نے کسی مادی مفاد کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل نہیں کیا تھا بلکہ اس لئے کیا تھا کہ وہ اسلامی معاشرہ میں، حضور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کا اتباع کرتے ہوئے زندگی بسر کر سکیں۔ انہوں نے ان نام نہاد مفکرین سے سخت نفرت کا اظہار کیا جو

قائدِ اعظمؒ کے نام سے کذب و افترا پھیلا رہے اور سیکولرازم اور اسی قسم کی دیگر الرجی کو اچھال رہے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ ایسے لوگوں سے نمٹنے کا ایک طریق تو یہ ہے کہ انہیں گرفتار کر لیا جائے۔ انہیں سزا دی جائے اور اُن کی تحریروں کو جلا دیا جائے۔ لیکن ایسا کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ اس کے لئے بہترین طریق یہ ہوگا کہ دلائل و براہین کی رُو سے ان کے جھوٹے پروپیگنڈہ کی مدافعت کی جائے، اور تاریخی حقائق و شواہد سے ان کے کذب و افترا کی تردید کی جائے۔

انہوں نے کہا کہ ملک میں ایسے اہلِ قلم اور صحافی موجود ہیں جو اس فریضہ کو بطریقِ احسن سرانجام دے سکتے ہیں۔

صدرِ مملکت کا یہ انتباہ نہایت ضروری اور مناسب تھا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حکومت کے زیرِ اقتدار اور زیرِ اثر ذرائع ابلاغ (ریڈیو۔ ٹی وی۔ جرائد و مجلات) کے نام ہدایات جاری کی جائیں کہ وہ، اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے ارشادات کی روشنی میں اس حقیقت کو مسلسل عام کریں کہ پاکستان کے حصول کا مقصد کیا تھا۔ اس کی مخالفت کس کس گوشے سے ہوئی۔ یہ لڑائی کیسے لڑی گئی۔ اور بالآخر اس مہم میں کامیابی کس طرح ہوئی۔ ان حقائق کی مسلسل اور متواتر نشر و اشاعت ازبس ضروری ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ضروری ہے کہ ہماری درس گاہوں (سکولوں اور کالجوں) میں بھی ان حقائق کو طلبا اور طالبات کے ذہن نشین کرایا جائے۔ اور سب سے اہم یہ کہ تحریکِ پاکستان کی ایک مستند تاریخ مرتب کرائی جائے۔ ایسی تاریخ وہی مرتب کر سکیں گے جو اس تحریک کے اسلامی مقاصد اور محرکات سے متفق تھے۔

(۴)

۳۔ غاصب کون ہے؟

گذشتہ اکتوبر، اسلام آباد میں منعقدہ خواتین کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے، مسٹر بروہی نے کہا:۔

عورتوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے اندر ایسا شعور بیدار کریں جس سے وہ اپنے حقوق حاصل کر سکیں۔ (انہوں نے کہا کہ) انہیں یہ حقوق خدا نے عطا کئے ہیں اور انہیں کوئی بھی ان سے ابدی طور پر محروم نہیں کر سکتا۔ (ڈی مسلم۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۰ء)

بروہی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ خدا کے عطا کردہ ان حقوق کو کس نے غصب کر رکھا ہے اور ان کی بازیابی کی صورت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں اس مقالہ کا مطالعہ مفید رہے گا جو طلوعِ اسلام کی اسی اشاعت میں "غاصبی قوانین" کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے۔

صدرِ مملکت نے اس کانفرنس میں البتہ یہ کہا کہ

حکومت امکان بھر کوشش کر رہی ہے کہ اس (ناروا) امتیازی سلوک کو جلد از جلد

ختم کیا جائے جو عورتوں کے خلاف اس وقت روا رکھا جا رہا ہے۔ (ایضاً)

(۰)

۴۔ یومِ اقبالؒ کی تعطیل

اقبالؒ نے اپنے متعلق کہا تھا کہ

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی — میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

بلکہ یہ کہ

دیا اقبالؒ نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا — یہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

اقبالؒ کسی زندہ قوم میں پیدا ہوتا تو معلوم کس کس انداز سے اس کی یادگاریں قائم کی جاتیں۔ لیکن اس "تن آسان" قوم کی بے نیازی نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا وہ عبرت کا مرقع اور احسان فراموشی کا محضر ہے ۱۹۴۷ء میں مرکزی حکومت نے اس کے یومِ وفات پر ملک بھر میں تعطیل کا اعلان کیا اور اسی سطح پر اس تقریب کو منایا بھی تھا۔ ۱۹۴۹ء میں اس تعطیل کو حذف کر دیا گیا تو طلوعِ اسلام نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور مرکزی حکومت کے ساتھ خط و کتابت کے بعد آخری وقت انہیں تعطیل کے لئے رضامند کر لیا۔ لیکن یہ رضامندی اسی سال تک محدود رہی۔ اس کے بعد احتجاجات کے باوجود چھٹی نہ دی گئی۔ ازاں بعد اس تعطیل کو پنجاب تک محدود کر دیا گیا۔ اس لئے کہ پنجاب اس کا وطن تھا۔ یہ اقبالؒ کی توہین اور اس کے پیغام کی عملی تردید تھی۔ وہ ساری عمر وطنیت کے خلاف نبرد آزما رہا اور اسے سب سے بڑا بت اور مذہب کا کفن" قرار دیتا رہا۔ یاروں نے اسے اسی وطنیت کا شاعر قرار دے دیا۔ پھر اسے مزید سمٹایا تو اس تعطیل کو درسگاہوں کی چار دیواری میں محصور کر دیا۔ اب اس سکڑی سمٹی ہوئی وطنی تعطیل کا حلیہ بھی اس طرح بگاڑا جا رہا ہے کہ ۹ نومبر کو یوم (پیدائش) اقبالؒ تھا اور ۸ نومبر کی شام تک طلبا کو علم نہ تھا کہ کل سکول اور کالج بند رہیں گے یا نہیں۔ اس کا اعلان ۹ نومبر کی صبح کے اخبارات میں ہوا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ کسی کو خبر ہوئی کسی کو نہ ہوئی۔ غرضیکہ عجب افراتفری کا عالم رہا۔ اور لاہور (کم از کم گلبرگ) کے "دیسی انگلش" سکولوں میں سے بعض کے متعلق ہمیں معلوم ہوا کہ انہوں نے حکومت کے فیصلہ کے باوجود اپنے ہاں تعطیل نہ کی۔

اور یہ کچھ اس اقبالؒ کے ساتھ ہو رہا ہے جس کے (اسی) یومِ پیدائش پر صدرِ پاکستان نے اپنے پیغام میں کہا ہے کہ

> وہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ ہی تھے جنہوں نے اپنی بصیرت اور اپنے فلسفہ کے ذریعے ملتِ اسلامیہ کو انتباہ کیا کہ وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہو... ان کے آفاقی پیغام کا تقاضا ہے کہ مسلمانانِ عالم اقبالؒ کے اسی قول کو حقیقت کا روپ دے کر اپنی زندگیوں کو اس میں ڈھال دیں۔ (نوائے وقت۔ ۹ نومبر ۱۹۸۰ء)

"آفاقی پیغام کا علمبردار، حکیم الامت۔ پوری ملتِ اسلامیہ کا نقیب، مسلمانانِ عالم کا مصلح" اور اس کا عملی مقام یہ کہ اس کے یومِ ولادت کی تعطیل تک کا بھی یہ حشر ہوا! ہمارا خیال ہے کہ اپنے اسی قسم کے حشر کا تصور کر کے اس نے کہا تھا کہ — بعدِ من ناید چو من مردِ فقیر — میرے بعد میرے جیسا کوئی پیغامبر اس قوم کے ہاں آنے کی ہمت نہیں کریگا! کسے خبر تھی کہ وہ ساری عمر جاں سوزی کرے اور اس کے بعد اپنا یہ حشر ہوتا دیکھے۔ یہ جو آپ مختلف متعارف اداروں کی طرف سے یومِ اقبالؒ کی تقریبات منانے کے انتظامات دیکھتے ہیں تو یہ اس مالی امداد کا جواز مہیا کرنے کے لئے ہوتے ہیں جو انہیں اقبالؒ کے نام پر حاصل ہوتی ہے۔ یہ امداد بند ہو جائے تو ان کے دفاتر سے اقبالؒ کے نام کا بورڈ تک بھی اتر جائے۔

(۰)

باب المراسلات

ادائیگی زکوٰۃ

ایک صاحب اپنے مراسلہ میں کہتے ہیں۔

"مرکزی حکومت نے اواخر اکتوبر ۱۹۸۰ء میں، زکوٰۃ آرڈیننس میں ایک ترمیم کی ہے جو اسلام آباد سے شائع ہونے والے اخبار "دی مسلم" کی اشاعت بابت ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں اس طرح شائع ہوئی ہے:۔

جو لوگ اپنے عقیدہ (FAITH) اور فقہ کی رُو سے زکوٰۃ ادا نہ کرنا چاہیں انہیں (فلاں فلاں ایجنسیوں یا لوکل کمیٹیوں کے روبرو) مقررہ کردہ فارم میں ایک اعلامیہ..... (DECLARATION) داخل کرنا ہوگا۔ اس کی بابت کسی مجسٹریٹ۔ یا اوتھ کمشنر یا نوٹیری پبلک کے سامنے، دو گواہوں کی موجودگی میں حلف بھی لینا ہوگا۔ اس اعلامیہ میں کہا جائے گا کہ

میں مسلمان ہوں اور فلاں مسلّمہ (RECOGNISED) فقہ کا پابند۔ میرا عقیدہ اور فقہ جس کا میں پابند ہوں، مجھے اس امر پر مجبور نہیں کرتی کہ میں وہ زکوٰۃ کلّی یا جزئی طور پر ادا کروں جس کا تعین زکوٰۃ اور عشر آرڈیننس میں کیا گیا ہے۔

اس کے بعد یہ مستفسر لکھتے ہیں:۔

میں مسلمان ہوں اور کسی فرقہ سے متعلق نہیں ہوں۔ کیونکہ فرقہ بندی قرآن مجید کی رُو سے شرک ہے۔ میری فقہ قرآنی احکام ہیں۔ اس عقیدہ اور قرآنی احکام کی رُو سے میں اپنے آپ کو آرڈیننس میں مقررہ کردہ زکوٰۃ کی ادائیگی پر مجبور نہیں پاتا۔

میرا خیال ہے کہ مجھے اپنے فارم میں یہی لکھنا چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ قرآنی تعلیم کی رو سے اپنے آپ کو صرف مسلمان کہتے ہیں اور کسی فرقہ سے وابستہ نہیں، حکومت انہیں مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ ضرور کسی نہ کسی مسلّمہ فرقہ سے وابستہ ہوں۔ اور جب ایک شخص کسی فرقہ سے وابستہ ہی نہیں تو وہ اپنے فارم میں یہ کیسے لکھ سکے گا کہ وہ فلاں فرقہ سے متعلق ہے۔ یہ تو صریحاً دروغ گوئی ہوگی۔

طلوع اسلام ہمارا خیال ہے کہ جو لوگ کسی فرقہ سے متعلق نہیں، حکومت انہیں مجبور نہیں کرنا چاہتی کہ وہ بالضرور کسی فرقہ سے وابستہ ہوں۔ نہ ہی حکومت کا یہ منشا نظر آتا ہے کہ ایسے لوگ

فارم میں غلط بیانی سے کام لیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسے حضرات اپنا فارم اسی طرح پُر کریں جس طرح مستفسر نے اوپر لکھا ہے۔

(۲) آرڈیننس کی ترمیم تو ہم نے بھی نہیں دیکھی لیکن اخبار "دی مسلم" (۳۰ اکتوبر ۱۹۸۰ء) کی اشاعت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ

کسی شخص کی درخواست پر فیڈرل شریعت کورٹ یہ فیصلہ کرے گی کہ داخل کردہ اعلامیہ، اس فقہ کے مطابق ہے یا نہیں جس کا، فارم دہندہ پابند ہے۔ اگر یہ کورٹ فیصلہ کرے کہ وہ اعلامیہ اس کے مطابق نہیں تو اس شخص کو زکوٰۃ یا عشر آرڈیننس کے مطابق ادا کرنا ہوگا۔

اس سے کچھ اُلجھنیں پیدا ہونے کا احتمال ہے جن کی وضاحت (حکومت کی طرف سے) ہونی ضروری ہے (مثلاً)۔

۱۔ حکومت، یہ کہہ کر کہ ہر شخص زکوٰۃ (یا عشر) اپنی اپنی فقہ کے مطابق ادا کر سکتا ہے، زکوٰۃ کو پبلک لاز کے دائرے سے نکال کر پرسنل لاز کے زمرے میں لے آئی ہے۔

شریعت بنچوں سے متعلق آرڈیننس کی رُو سے مسلم پرسنل لاز، شریعت بنچوں کے دائرہ کار سے خارج قرار دیئے گئے ہیں، اس صورت میں، زکوٰۃ سے متعلق اعلامیہ کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ شریعت کورٹ کس طرح کر سکے گی؟

۲۔ زکوٰۃ آرڈیننس، دستورِ پاکستان میں ترمیم کے ذریعے نافذ کیا گیا ہے۔ شریعت بنچوں سے متعلق آرڈیننس میں دستور (کانسٹی ٹیوشن) کو بھی بنچوں کے دائرۂ کار سے خارج قرار دیا گیا ہے۔ ان حالات میں معلوم نہیں، شریعت کورٹ متعلقہ فارم کا فیصلہ کس طرح کر سکے گی؟

ان نقاط کا تعلق بہرحال قانون اور آئین سے ہے جن کا، حکومت یا ماہرینِ قانون ہی صحیح جائزہ لے سکتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں یہ دو نقاط کھٹکے تھے جن کا اظہار ہم نے ضروری سمجھا ہے۔

زکوٰۃ فارم کے متعلق آئندہ حکومت کی وضاحت یا شریعت کورٹ کا فیصلہ، عوام کی دلچسپی کا موجب ہوگا۔ اگر کوئی صاحب اس قسم کا فارم داخل کریں تو اس کے متعلق جو فیصلہ ہو اس سے ہمیں مطلع فرمائیں۔ اس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہوں گے۔ ایسا فیصلہ بڑا اہم ہوگا۔ اور دُور رس نتائج کا حامل۔ فارم بھیجنے کے طریق کے متعلق اس بینک سے دریافت کر لیں جس میں آپ کا حساب ہو یا مقامی لوکل کونسل سے۔

واضح رہے کہ اگر حکومت زکوٰۃ (اور عشر) کے احکام کو قانونِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کرتی تو اس میں کسی کے عقیدہ کا سوال پیدا نہ ہوتا۔ اس قانون کی تعمیل ہر ایک کے لئے لازمی ہوتی۔ لیکن جب حکومت نے اسے "اسلامی قانون" کی حیثیت سے نافذ کیا ہے اور ہر ایک کو اجازت دی ہے کہ وہ اس سے مستثنےٰ ہونے کے لئے اپنے عقیدہ اور فقہ کے مطابق فارم داخل کرے، تو جو لوگ حکومت کی طے کردہ زکوٰۃ کو اپنے عقیدہ کے مطابق نہیں سمجھتے، انہیں حکومت خود دعوت دیتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے مستثنےٰ قرار دلالیں۔ ایسے حضرات کو حکومت کی اس اجازت سے فائدہ اٹھانے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہیئے۔

(۰)

عائلی قوانین

(MUSLIM FAMILY LAWS)

۱۹۶۱ء میں عائلی قوانین کا آرڈی ننس جاری ہوا۔ اس کے اجراء کے ..... ساتھ ہی قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس طرح مخالفت کا طوفان برپا کر دیا گیا گویا اس سے اسلام کی پوری کی پوری عمارت منہدم ہو جائے گی۔ اس کے بعد موقعہ بے موقعہ، ان قوانین کے خلاف ہلّہ بولا جاتا رہا لیکن حکومت کے عزم اور استقامت نے اس سیلاب کو روکے رکھا۔ حتیٰ کہ ہماری نیشنل اسمبلی کے پہلے سیشن (منعقدہ جون۔ جولائی ۱۹۶۲ء) میں انہیں منسوخ کرنے کی ایک تحریک بھی پیش کر دی گئی، لیکن یہ سخت جان اس کی زد سے بھی بچ نکلا۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں اس آرڈی ننس کو تحفظ دے دیا گیا (کہ ان قوانین کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا) تو قدرے اطمینان ہوا۔ لیکن اب کچھ دنوں سے پھر مخالفت کے بحرِ خاموش میں ہلکورے اٹھ رہے ہیں اور ہر قلب حساس یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا

کبھی اخبارات میں یہ خبر شائع ہو جاتی ہے کہ ان قوانین کو منسوخ کیا جا رہا ہے۔ پھر اسی خبر کی تردید ہو جاتی ہے۔ چند دنوں کے بعد پھر تنسیخی کی خبر کا اعادہ ہو جاتا ہے اور پھر اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اواخر اکتوبر میں اسلام آباد میں منعقدہ خواتین کانفرنس میں ایک ریزولیوشن پاس ہوا جس میں کہا گیا ہے کہ ان قوانین کو منسوخ نہ کیا جائے۔ معلوم نہیں کہ جب یہ پرچہ قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا تو آخری خبر کیا ہو گی!

اس مدّ و جزر (جوار بھاٹا) سے فضا کا مرتعش ہو جانا لازمی تھا۔ چنانچہ ہمیں استفسارات موصول ہو رہے ہیں (بالخصوص نوجوان طبقہ کی طرف سے) کہ یہ قوانین کیا ہیں اور ان میں وہ کون سا خطرہ پوشیدہ ہے جس کی وجہ سے ان کے خلاف مخالفت کا طوفان بیس سال سے جاری ہے۔

یہ سوالات طلوعِ اسلام سے کیوں کئے جا رہے ہیں، اور اس کا ان کے ساتھ کیا تعلق ہے —— یہ داستان دلچسپ ہے۔ طلوعِ اسلام کا مشن قرآنی تعلیمات کا عام کرنا ہے۔ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کمزوروں۔

ضعیفوں۔ محتاجوں اور ناتوانوں کے حقوق کا تحفظ ہے۔ اور طلوعِ اسلام علیٰ قدرِ وسعت، اس اہم فریضہ کی ادائیگی میں مصروف چلا آرہا ہے۔ ہماری قوم میں سب سے زیادہ مظلوم طبقہ عورتوں کا ہے، اور طلوعِ اسلام شروع سے یہ کوشش کرتا چلا آرہا ہے کہ انہیں وہ حقوق حاصل ہو جائیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کئے تھے لیکن خود اپنوں کی دستبرد نے جنہیں صدیوں سے غصب کر رکھا ہے۔ عائلی قوانین ان حقوق کی بحالی کی طرف ایک خفیف سی پیش رفت تھی۔

مخالفت کے لئے دلائل کس قسم کے دیئے جاتے ہیں، یہ سننے کے قابل ہے:۔

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے اُس زمانے کے صدر اور ممتاز عالم مولانا محمد داؤد غزنوی (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) نے کہیں کہہ دیا کہ یہ قوانین ایسے نہیں کہ تمام کے تمام مسترد کر دیئے جائیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جنہیں جزئی ترمیمات کے بعد قبول کیا جا سکتا ہے۔ اس پر (سابقہ) جماعتِ اسلامی کے ترجمان 'ایشیا' نے اپنی ۲۰ اگست ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں ان پر بڑی لے دے کی اور لکھا کہ

"مولانا جب یہ استدلال کر رہے ہیں تو ہم حیرت کے ساتھ سوچ رہے ہیں کہ ان کے قلم سے، مولانا محمد داؤد غزنوی، امیر مرکزی جمعیتِ اہلِ حدیث بول رہے ہیں یا منکرینِ سنّت کے سرخیل غلام احمد پرویز۔ حکومت کے سربراہ اور امیرِ مملکت کو ——— وہ کسے باشد ——— حضرت عمرؓ کے مقام پر رکھ کر شریعتِ اسلامی کی تعبیر کرنے کا حق دینا، وہ خیال اور مضل نظریہ ہے جس نے عہدِ حاضر میں اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ پیدا کر دیا ہے اور جس کی آڑ لے کر آج اسلام کا حلیہ، ترکی۔ مصر۔ انڈونیشیا۔ تیونس اور دوسرے ممالک میں بگاڑا جا رہا ہے۔ اور پاکستان میں بھی اس کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔ اس نظریہ کے حق میں منکرینِ سنت بالکل وہی دلیل دیتے ہیں جو اہلِ حدیث مولانا غزنوی نے پیش فرمائی ہے۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام۔ بابت اکتوبر ۱۹۶۳ء)

یعنی دلیل یہ نہیں کہ یہ قوانین کس طرح اسلام کے خلاف ہیں؟ دلیل یہ ہے کہ "غلام احمد پرویز" نے ان کی تائید کیوں کی ہے؟ اور ان کا یہ جرم اس قدر سنگین ہے کہ اگر ایک جید اہلِ حدیث عالم بھی ان سے متفق ہے تو اُسے بھی بخشا نہیں جا سکتا!

جب (۱۹۶۱-۶۲ء میں) ان قوانین کے خلاف پہلے پہل شورش برپا ہوئی تو طلوعِ اسلام نے (اپنی اگست ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں) ایک مقالہ شائع کیا تھا جس میں ان قوانین کا تجزیہ کیا گیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ یہ کس حد تک قرآنِ کریم کی منشاء کے مطابق ہیں اور ان میں کہاں تک ترمیم و اصلاح کی گنجائش ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حالیہ استفسارات کے جواب میں اگر اس مقالہ کو (بادنیٰ تغیر) شائع کر دیا جائے تو اس سے معاملہ کی وضاحت ہو جائے گی۔ لیکن اس مقالہ کے درج کرنے سے پہلے، ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ مختصر الفاظ میں یہ بتا دیا جائے کہ وہ "قوانینِ شریعت" کس قسم کے تھے جن کا اطلاق عورتوں پر ہوتا تھا اور جن میں قدرے اصلاح کے لئے عائلی قوانین نافذ کئے گئے تھے۔ ان قوانین کی رُو سے:۔

۱۔ نابالغ لڑکی کا نکاح کیا جا سکتا ہے۔ اور صرف نکاح ہی نہیں، اس سے جنسی اختلاط بھی جائز ہے۔ "نابالغ لڑکی سے جنسی اختلاط!"
نکاح، ولی کی اجازت سے کیا جا سکتا ہے۔ (بلکہ ولی کی اجازت ضروری ہے)۔

۲۔ مرد جب چاہے، چار عورتوں تک سے شادی کر سکتا ہے۔ پہلی بیوی یا بیویاں اس پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتیں۔ ان میں سے وہ جب جی چاہے کسی بیوی کو طلاق دے کر، اس کی جگہ نئی بیوی لا سکتا ہے۔

۳۔ مرد جب جی چاہے "طلاق۔ طلاق۔ طلاق" کہہ کر بیوی کو رخصت کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اگر (غصہ فرو ہو جانے پر) اسے اپنے کئے پر ندامت ہو، اور وہ اپنی (مطلقہ) بیوی سے از سرِ نو ازدواجی تعلقات وابستہ کرنا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ (مظلومہ) خواہ ایک رات کے لئے کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے۔ اس کے ساتھ شب بسری کرے۔ دوسری صبح وہ مرد اسے طلاق دے دے۔ اس کے بعد یہ اپنے سابقہ شوہر سے نکاح کر سکتی ہے۔ اسے حلالہ کہا جاتا ہے۔
بیوی اگر مستبد خاوند سے جان چھڑانا چاہے تو اسے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا ہوگا۔

۴۔ یہ تو رہے وہ قوانین جن کا تعلق میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات سے ہے۔ ایک قانون ایسا بھی ہے جو وراثت سے متعلق ہے اور جس کی مخالفت سب سے زیادہ شدت سے ہوتی ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ اگر کسی لڑکے کا باپ فوت ہو جائے اور وہ یتیم رہ جائے۔ اس کے بعد اس کا دادا مر جائے، تو اس دادا کی وراثت سے اس یتیم بچے کو کچھ نہیں مل سکتا۔ سارے کا سارا ترکہ اس کا چچا لے جائے گا۔

یہ تھے وہ قوانین جن میں اصلاح کی خاطر عائلی قوانین نافذ کئے گئے تھے۔ ہمارا مذہب پرست طبقہ ان (عائلی قوانین کو) منسوخ کر کے، پھر سے مذکورہ بالا قوانین نافذ کرانا چاہتا ہے۔

(۰)

اس تمہید کے بعد وہ مقالہ دیکھئے جو طلوعِ اسلام میں (۱۹۶۲ء میں) شائع ہوا تھا۔ اس میں پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ زیرِ نظر معاملہ کے متعلق قرآنِ کریم کے احکام کیا ہیں اور اس کے بعد، اس سے متعلق ۱۹۶۱ء کا نافذ کردہ عائلی قانون درج کیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ قانون قرآنِ مجید کے خلاف ہے یا اس کے مطابق۔

عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء

(قرآنِ کریم کی روشنی میں)

۱۔ نکاح:۔ قرآنِ کریم کی رُو سے، ایک مرد اور عورت کا، ان تمام ذمہ داریوں اور حقوق کو لئے ہوئے

جو اللہ تعالیٰ نے اس باب میں متعین کئے ہیں، میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا معاہدہ "نکاح" کہلاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسے مِیثَاقًا غَلِیظًا (۴/۲۱)۔ "پختہ عہد" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ معاہدہ کسی خاص مدت کے لئے (وقتی) نہیں ہوتا بلکہ جب تک اسے اُس طریق کے مطابق جو قرآنِ مجید نے مقرر کیا ہے، (یعنی طلاق) فسخ نہ کیا جائے، قائم رہتا ہے۔

اس معاہدہ کی شرائط

معاہدہ کوئی بھی ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ فریقین بالغ ہوں اور وہ معاہدہ ان کی باہمی رضامندی سے بلا کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہو۔ قرآنِ کریم نے معاہدۂ نکاح کے لئے، ان دونوں شرطوں کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس نے بلوغت کے لئے "نکاح کی عمر" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

بلوغت سورۂ نساء میں ہے:۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ (۴/۶)

(تم جب یتیموں کے سرپرست بنو تو) انہیں پرکھتے رہو تا آنکہ وہ "نکاح کی عمر" کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال و متاع ان کے حوالے کر دو۔

یہاں کہا گیا ہے کہ جب یتیم "نکاح کی عمر" کو پہنچ جائیں تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ اور سورۂ انعام میں ہے: حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ (۶/۱۵۲) جب وہ "جوانی کی عمر" تک پہنچ جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے "نکاح کی عمر" جوانی ہے۔ جب تک لڑکا اور لڑکی جوان نہ ہو جائیں، وہ نکاح کی عمر کو نہیں پہنچتے۔ لہٰذا، قرآن کی رُو سے نابالغ کی شادی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ نکاح کی عمر کو نہیں پہنچا۔ بلوغت کی عمر کا تعین، ہر ملک کے حالات کے مطابق، اسلامی حکومت خود کرے گی۔ قرآن نے اسی لئے اسے غیر معین رکھا ہے۔

یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال کی تھی، تو یہ غلط ہے، نکاح کے وقت ان کی عمر سترہ اور اُنیس برس کے درمیان تھی۔

(ب) نکاح کے لئے باہمی رضامندی ضروری ہے۔ چنانچہ مردوں کے متعلق ہے:۔

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۴/۳)

تم ایسی عورتوں سے شادی کرو جو تمہیں پسند ہوں۔

اور عورتوں کے متعلق کہا کہ

لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ۭ (۴/۱۹)

تمہارے لئے قطعاً جائز نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔ ایسا کرنا حلال ہی نہیں۔

لہٰذا جس نکاح میں مرد اور عورت دونوں کی رضامندی شامل نہیں، وہ نکاح، قرآن کی رُو سے نکاح ہی نہیں

کہلا سکتا۔

چونکہ کم سنی میں نکاح ہو نہیں سکتا، اس لئے نکاح کے لئے ولی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالغ لڑکی کا کوئی ولی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے معاملات کی خود مختار ہوتی ہے۔ مشورہ کی بات اور ہے۔

۲۔ نکاح سے مقصد

(ا) نکاح سے مقصد محض جنسی جذبہ کی تسکین نہیں بلکہ ان تمام ذمہ داریوں کا پورا کرنا ہے جو نکاح سے عائد ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص محض جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے نکاح کرتا ہے، اور ان ذمہ داریوں کی پرواہ نہیں کرتا جو نکاح کی رُو سے عائد ہوتی ہیں، تو قرآن کریم کی رُو سے وہ حقیقی معنوں میں نکاح نہیں ہوتا۔ اس نے، اس کی وضاحت: مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ ط (۴/۲۴) کہہ کر کر دی ہے ــــــ "مُحْصِنِيْنَ" کے معنی ہیں، حدود و قیود کے اندر رہنے کے لئے۔ اور "مُسَافِحِيْنَ" سے مراد ہے محض جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے۔

حقوق و فرائض

(ب) نکاح سے، مرد اور عورت دونوں پر یکساں حقوق اور یکساں فرائض عائد ہوتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ص (۲/۲۲۸) "قاعدے اور قانون کے مطابق، عورت کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں، جتنی اس کی ذمہ داریاں ہیں۔

(ج) میاں بیوی کے تعلقات ایسے خوشگوار ہونے چاہئیں کہ اس سے گھر میں سکون اور اطمینان پیدا ہو۔ قرآن کریم کی رُو سے "ازواج" (جوڑوں) کا مطلب ہی یہ ہے کہ لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا۔ (۳۰/۲۱) ان سے تسکین حاصل ہو، اور باہمی محبت اور رفاقت پیدا ہو۔ وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ط (۳۰/۲۱) ایسے گھر کو خدا جنت سے تعبیر کرتا ہے۔ (۲/۲۲۱) اس کے برعکس، جس میاں بیوی میں ہم آہنگی خیالات نہ ہو، ان کے گھر کو وہ جہنم کہہ کر پکارتا ہے۔ (۲/۲۲۱)

عائلی قوانین

عائلی قوانین کی رُو سے، نابالغ لڑکی یا لڑکے کے نکاح کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے اور یہ قرآن کی منشاء کے مطابق ہے۔ علماء حضرات اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

(د) رجسٹریشن

چونکہ نکاح ایک معاہدہ ہے اس لئے اسے ضبطِ تحریر میں لے آنا، اور سرکاری ریکارڈ میں درج کرا دینا ہی بہتر ہے۔ اس سے مستقبل میں پیدا ہونے والے بہت سے جھگڑے مٹ جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے

ط اس آیت میں جو ہے: وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ تو اس کا مفہوم "طلاق اور عدت" کے عنوان میں بیان کیا جائے گا۔

تو باہمی لین دین کے معاملات کو بھی تحریر میں لانے کی سخت تاکید کی ہے (۲/۲۸۲) - نکاح کا معاہدہ اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

عائلی قوانین میں، اس معاہدہ کو سرکاری رجسٹر میں درج کرانے کی تاکید کی گئی ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں کونسی بات خلافِ شریعت ہے۔

۲- مہر

(ا) چونکہ ازدواجی میزان میں، عورت کا پلڑہ، بمقابلہ مرد کے، جھکتا ہے (یعنی عورت کی قدر و قیمت مرد کے مقابلہ میں زیادہ ہے) اس لئے، مرد کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ کچھ تحفہ عورت کو دے۔ اسے مہر کہا جاتا ہے۔ یہ مہر کسی بات کا معاوضہ نہیں ہوتا۔ بلکہ کسی قسم کے معاوضہ کے خیال کے بغیر، بطور تحفہ دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے قرآنِ کریم نے نِحۡلَةً کا لفظ استعمال کیا ہے (۴/۴) جس کے معنی ہیں "بلا بدل"۔

(ب) قرآن نے مہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی۔ جو کچھ بھی باہمی رضامندی سے طے ہو جائے وہ مہر ہے۔ لیکن چونکہ اس کا ادا کرنا ضروری ہے، اس لئے اسے علیٰ قدرِ وسعت ہونا چاہیئے۔ (دیکھئے ۲/۲۳۶ ; ۴/۲۰)

(ج) مہر، عورت کی ملکیت ہوتا ہے اور کسی کو حق نہیں کہ اُسے اس سے محروم کر دے۔ البتہ عورت اپنی رضامندی سے اس میں سے کچھ چھوڑ بھی سکتی ہے۔ (۴/۴)

(د) اگر کسی وجہ سے مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو اسے مرد کی وسعت کے مطابق طے کر لینا چاہیئے (۲/۲۳۶)

عائلی قوانین میں کہا گیا ہے کہ اگر شادی معاہدہ مہر کی ادائیگی کے طریق کار کے متعلق کوئی تفصیل موجود نہ ہو تو مہر کی کل رقم کے متعلق یہ تصوّر کیا جائے گا کہ وہ عندالطّلب واجب الادا ہے۔ قرآنِ کریم میں مؤجل اور معجّل کی کوئی تفریق نہیں۔

۳- طلاق

(ا) طلاق کے معنی ہیں "نکاح کے معاہدہ سے آزاد ہو جانا"۔ چونکہ یہ معاہدہ فریقین (مرد اور عورت) نے باہمی رضامندی سے استوار کیا تھا اس لئے ان میں سے کسی ایک کو اس کا حق نہیں پہنچ سکتا کہ وہ، جب جی چاہے، اپنی مرضی سے، اس معاہدہ کو منسوخ کر دے۔ اس میں دوسرے فریق کا تحفّظ ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اسے انفرادی فیصلہ پر نہیں چھوڑا بلکہ معاشرہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے۔ (معاشرہ سے مراد وہ نظام ہے جو متنازعہ فیہ معاملات میں فیصلہ کرنے کے لئے اسلامی مملکت کی طرف سے قائم ہو۔ اسے عدالت کہا جائے گا)۔ چنانچہ اس باب میں، سورۃ النسآء میں ہے :-

اگر تم کسی میاں بیوی میں، باہمی اختلاف۔ جھگڑے یا مخالفت (شقاق) کا خدشہ محسوس کرو،

تو ایک ثالثی بورڈ بٹھا دے، جس میں ایک ممبر مرد کے خاندان کا اور ایک عورت کے خاندان کا ہو۔ اس بورڈ کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ ان دونوں میں مصالحت کرائے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو امید کی جا سکتی ہے کہ میاں بیوی میں موافقت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ (۴/۳۵)

(۲) اگر ثالثوں کی کوشش سے ان میں موافقت کی صورت نکل آئے تو ہو المراد ——— لیکن اگر وہ اپنی کوشش میں ناکام رہیں تو ظاہر ہے کہ انہیں اس معاملہ کی رپورٹ اس عدالت کے پاس بھیجنی ہو گی جس نے انہیں ثالث مقرر کیا تھا۔ وہ عدالت فیصلہ کرے گی کہ فریقین میں طلاق ہو جانی چاہیئے۔ اور اس کی شرائط کیا ہوں گی۔ عدالت کے اس فیصلے کا نام 'طلاق' ہو گا۔ واضح رہے کہ اگر میاں یا بیوی میں سے کوئی ایک بھی مصالحت سے انکار کرے تو عدالت کے لئے طلاق کا حکم نافذ کرنا ضروری ہو گا ——— انہیں زبردستی نکاح میں باندھے نہیں رکھا جا سکتا۔

طلاق کے بارے میں عائلی قوانین میں جو طریق کار تجویز کیا گیا ہے وہ قرآن کی منشا کے مطابق ہے لیکن اس میں دو ایک نقص ہیں، جن کا دور کیا جانا ضروری ہے۔

(i) اس میں کہا گیا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے وہ طلاق کا اعلان کرنے کے فوراً بعد اس امر کی اطلاع (نوٹس) یونین کے چیئرمین کو دے۔

(ii) چیئرمین ایک ثالثی کونسل مقرر کرے گا تاکہ فریقین میں مصالحت کرائی جائے۔

اگر مصالحت نہ ہو سکے تو، نوٹس کی تاریخ سے نوّے دن کے بعد، طلاق مؤثر ہو جائے گی۔

یعنی معاہدہ نکاح منسوخ تصوّر ہو گا۔

شق (i) میں نقص یہ ہے کہ

(ا) اس میں مرد کو حق دیا گیا ہے کہ وہ جب جی چاہے، طلاق کا اعلان کر دے۔ یہ خلافِ قرآن ہے۔ اس شق کو یوں تبدیل کر دینا چاہیئے کہ

جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کرے، اسے چاہیئے کہ وہ اپنے اس ارادہ کی اطلاع چیئرمین کو دے۔

اس صورت میں مصالحت کے کچھ معنی بھی ہوں گے۔ ورنہ طلاق کا اعلان کر دینے کے بعد، ثالثی بورڈ کا تقرر اور مصالحت کی کوشش، بے معنی ہے۔

(ب) دوسرا نقص یہ ہے کہ اس میں طلاق کے اعلان کا حق مرد کو دیا گیا ہے۔ عورت کو نہیں۔ عورت کے متعلق کہا گیا ہے کہ

اگر طلاق کا حق باضابطہ طور پر بیوی کو دیا گیا ہو تو (وہ طلاق کا اعلان کر کے ثالثی کونسل کی طرف رجوع کر سکتی ہے)۔

"بیوی کو طلاق کا حق باضابطہ طور پر دینے" کا مطلب کچھ نہیں۔ معاہدہ نکاح کی رُو سے، میاں اور بیوی دونوں کو یکساں حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے جن حالات میں، مرد، طلاق حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے۔ انہی حالات

میں عورت بھی ویسا ہی حق رکھتی ہے۔ یہ بات تو بڑی تعجب انگیز سی ہوگی کہ معاہدہ تو فریقین کی رضامندی سے ہو اور اس کے فسخ کرنے یا کرانے کا حق صرف ایک فریق کو حاصل ہو۔ دوسرے کو حاصل نہ ہو!

عائلی قوانین کی رُو سے، اگر بیوی کو، "باضابطہ طلاق کا حق" نہ دیا گیا ہو، تو اسے تنسیخ نکاح کے لئے عدالت میں مقدمہ دائر کرنا پڑتا ہے۔ میاں اور بیوی کے لئے، الگ الگ قوانین، قرآن کے منشاء کے خلاف ہے۔

لہٰذا اس شق کا اطلاق میاں اور بیوی دونوں پر یکساں ہونا چاہیئے۔ یہ ترمیم نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر مرد کو یہ حق ہر وقت رہتا ہے کہ وہ جب جی چاہے طلاق کا اعلان کر دے۔ اس کے بعد ثالثی کونسل میں جاکر کہہ دے کہ میں مصالحت کرنے پر تیار نہیں۔ ثالثی کونسل اس میں کچھ نہیں کر سکے گی۔ مرد طلاق دے چکا۔ وہ طلاق مؤثر ہو گی۔ یہ وہی ظلم ہے جو مردوں کے ہاتھوں عورتوں پر ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس قانون نے اس ظلم میں کسی قسم کی کمی یا اصلاح نہیں کی۔ لہٰذا، اس شق کی صورت یوں ہونی چاہیئے کہ

میاں یا بیوی میں سے جو کوئی، معاہدۂ نکاح کو فسخ کرنے کا ارادہ کرے، اسے چاہیئے کہ اس امر کی اطلاع چیئرمین کو دے۔ .....

شق (ii)

میں کہا گیا ہے کہ اگر مصالحت نہ ہو سکے تو نوٹس کی تاریخ کے نوّے دن بعد، طلاق مؤثر سمجھی جائیگی۔ (نوّے دن بطور عدّت رکھے گئے ہیں)۔

قرآنِ کریم کی رُو سے

(ا) طلاق اس دن ہو گی جب عدالت فیصلہ کرے کہ فریقین کا معاہدۂ نکاح فسخ کیا جاتا ہے۔ عدّت بھی اُسی وقت سے شروع ہو گی۔

(ب) عدّت کی مدت، مختلف حالات میں مختلف ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ تفصیلی طور پر مذکور ہے۔ وہی مدت ہمارے قانون میں درج ہونی چاہیئے۔ موجودہ شق ناقص ہے۔

نوٹ:۔ ان تمام معاملات میں، عائلی قوانین کی رُو سے، یونین کونسل اور اس کے چیئرمین کو مجاز قرار دیا گیا ہے، ہماری رائے میں اس کی جگہ کسی باقاعدہ عدالت کو یہ اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔[1]

طلاق کے متعلق اس پوری کی پوری شق کی سخت مخالفت ہوئی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ

(ا) مرد کو حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے۔ طلاق، طلاق، طلاق کہہ کر بیوی کو گھر سے نکال دے۔ عورت کو ایسا حق حاصل نہیں۔

---

[1] یونین کونسلوں کے ختم ہو جانے کے بعد، اس کے لئے فیملی کورٹ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ (۱۹۸۰ء)

(۲) اگر عورت گلو خلاصی کرانا چاہے تو اسے عدالت کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور اسے ثابت کرنا ہوگا کہ وہ واقعی علیحدگی کی مستحق ہے۔ اسے طلاق نہیں بلکہ خلع کہا جاتا ہے جس کے لئے عورت کو "حق مہر" چھوڑنا پڑتا ہے۔

(۳) یہ بات مرد کے دائرۂ اختیار میں ہے کہ وہ عورت کو طلاق کا حق تفویض کرے یا نہ کرے۔

۴۔ طلاق کے بعد

(ا) عدالت کے فیصلہ سے نکاح منسوخ ہوگیا۔ اس کے بعد، عدّت کے دوران، یہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح نہیں کرسکتی۔ لیکن اگر یہ (سابقہ) میاں بیوی چاہیں آپس میں شادی کرسکتے ہیں۔

(ب) جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، عدّت کے دوران یہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ لیکن مرد پر اس کی کوئی پابندی نہیں۔ وہ جب چاہے، کسی دوسری عورت سے شادی کرسکتا ہے، بس یہ ایک "زائد حق" ہے جو عورت کے مقابلہ میں مرد کو حاصل ہے۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (۲/۲۲۸) میں اسی زائد حق کی طرف اشارہ ہے۔

(ج) اگر یہ سابقہ میاں بیوی چاہیں تو عدّت کی مدّت کے بعد بھی آپس میں شادی کرسکتے ہیں۔ اگر انہوں نے (عدّت کے دوران یا اس کے بعد) آپس میں شادی کرلی لیکن اس کے بعد پھر، مذکورہ بالا طریق کے مطابق، ان میں طلاق ہوگئی، تو دوسری مرتبہ بھی یہ میاں بیوی، عدّت کے دوران یا عدّت کے بعد، آپس میں شادی کرسکتے ہیں۔ (یہ دوسری مرتبہ کی طلاق کے بعد کی، شادی ہوگی)۔

لیکن اگر ان میں پھر طلاق کی نوبت آجائے (یعنی تیسری مرتبہ طلاق ہوجائے) تو پھر یہ میاں بیوی آپس میں شادی نہیں کرسکتے، نہ عدّت کے دوران، نہ اس کے بعد۔ قرآن میں ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ص فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ م بِاِحْسَانٍ ط (۲/۲۲۹)۔ "طلاق دو مرتبہ کی ایسی ہے جس کے بعد تم، قاعدے کے مطابق، عورت کو (نکاح میں) روک سکتے ہو یا حسن کارانہ انداز سے رخصت کرسکتے ہو"۔ لیکن تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد تم آپس میں نکاح نہیں کرسکتے، یہ مطلب ہے "تین طلاق" سے۔

عائلی قوانین

میں یہ شق قرآن کریم کی منشاء کے مطابق ہے۔ البتہ اس میں ذیل کے اضافے کی ضرورت ہے۔ یعنی

(د) تیسری طلاق کے بعد اگر اس عورت کو نئے خاوند سے طلاق مل جائے۔ یا وہ فوت ہوجائے، تو پھر یہ عورت، اگر چاہے، تو اپنے سابقہ خاوند سے شادی کرسکتی ہے۔ (۲/۲۳۰)

مولوی صاحبان اس شق کے بھی سخت خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مرد کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے، تین دفعہ (طلاق۔ طلاق۔ طلاق) کہہ دے۔ اس کے بعد وہ عورت اس پر حرام ہوجائے گی۔ اس

کے پھر سے حلال ہونے کی ایک ہی شکل ہے کہ یہ عورت (خواہ ایک رات کے لئے) کسی دوسرے آدمی سے نکاح کرے۔ اس کے ساتھ شب بسری کرے۔ دوسری صبح وہ مرد اسے طلاق دے دے۔ اس کے بعد یہ اپنے سابقہ خاوند سے نکاح کر سکتی ہے۔ اس طریق کو حلالہ کہتے ہیں۔

(۰)

۵۔ تعددِ ازدواج (ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح)

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، نکاح سے مقصد یہ ہے کہ انسان امن و سکون کی زندگی بسر کر سکے۔ میاں بیوی میں باہمی محبت اور رفاقت کا تعلق ہو جس سے گھر "جنت" بن جائے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس نے تاکید کی ہے کہ بیوی (یا میاں) کے انتخاب میں خیالات اور نظریات کی موافقت کا خیال رکھا جائے۔ نکاح فریقین کی رضامندی سے، بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہو۔ اس قدر احتیاط کے باوجود، اگر تجربہ بتائے کہ انتخاب صحیح نہیں تھا اور اس رشتے کا نباہ مشکل ہے، تو نکاح کا معاہدہ فسخ کر لیا جائے، اور بیشک کسی دوسری عورت (یا مرد) سے شادی کر لی جائے۔ سورۂ نساء میں ہے: وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ..... (۴/۲۰) "اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہو (تو اس طریق کے مطابق جس کا ذکر طلاق کے عنوان میں کیا جا چکا ہے) پہلی بیوی سے، معاہدۂ نکاح فسخ کر لو، اور پھر دوسری عورت سے شادی کرو"۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، شادی کا اُصول "ایک وقت میں ایک بیوی" (MONOGAMY) ہے۔

ہنگامی حالات

(۲) لیکن قرآنِ کریم اسے بھی تسلیم کرتا ہے کہ بعض اوقات ایسے ہنگامی حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن کے پیشِ نظر، اس اصولی قانون میں، استثناء کی ضرورت لاحق ہو جائے۔ اس قسم کے حالات، اسلام کے ابتدائی دَور میں مدینہ کی زندگی میں پیدا ہو گئے تھے۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ

(۱) مسلمانوں کی ایک محدود سی جماعت تھی (جنگِ بدر میں، جو ۲ھ میں ہوئی تھی، مسلمان مجاہدین کی تعداد صرف ۳۱۳ تھی)۔

(۲) مسلسل لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو رسول اللہؐ کی پوری مدنی زندگی میں جاری رہا۔

(۳) ان لڑائیوں کی وجہ سے، اس مختصر سی جماعت میں نوجوان افراد کی کمی ہوتی چلی گئی اور بیوائیں اور یتیم بچے دن بدن زیادہ ہوتے گئے۔ ان کے علاوہ مسلمان عورتیں، مکہ میں اپنے غیر مسلم خاوندوں کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف آنا شروع ہو گئیں۔

(۴) مسلمان عورتیں، صرف مسلمان مردوں سے شادی کر سکتی تھیں۔ کسی غیر مسلم سے نہیں کر سکتی تھیں۔ حتیٰ کہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) سے بھی نہیں۔

(۵) لہٰذا، اس وقت صورت یہ پیدا ہو گئی کہ بیواؤں کی، اور شادی کے قابل لڑکیوں کی تعداد، مردوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہو گئی۔ بیواؤں کے ساتھ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم اور لاوارث رہ گئے۔

(۶) ان ہنگامی حالات میں، اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ "ایک بیوی" کے اصولی قانون میں استثناء (EXCEPTION) کر دی جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر، قرآن نے کہا کہ

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ..... (۴/۳)

اس آیت کے تین حصے ہیں اور تینوں کا ترجمہ اور مفہوم حسب ذیل ہے:-

(۱) وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی .....

اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتامیٰ کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے ..... تو

عربی زبان میں "یتامیٰ" یتیم بچوں کو بھی کہتے ہیں اور ان عورتوں کو بھی جن کے شوہر نہ ہوں۔ (خود قرآن کریم میں یتامی النساء انہی معنوں میں آیا ہے۔ ۴/۱۲۷) لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں جس میں تم دیکھو کہ معاشرہ میں یتیم بچے اور بے شوہر کی عورتیں زیادہ ہو گئی ہیں، اور ایک مرد ایک عورت کے اصول کے مطابق، ان کے مسئلہ کا منصفانہ حل نہیں مل سکتا تو کیا کرو؟

(۲) فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ

ان میں سے جو عورتیں تمہیں پسند ہوں، ان سے نکاح کر لو۔ دو، دو، تین، تین۔ چار، چار تک۔

یعنی ایسی صورت میں "ایک بیوی" کے اصول میں استثناء کر لو اور ان بے شوہر عورتوں کو اپنے خاندان کا جزو بنا لو۔ جتنی ان کی تعداد ہو اس لحاظ سے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ لاوارث عورتیں اور ان کے بچے، مختلف خاندانوں میں جذب ہو جائیں۔ (یہ تدابیر اسلامی حکومت کی طرف سے طے ہوں گی)۔

(۳) فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ۚ

لیکن اگر تمہیں خدشہ ہو کہ تم عدل نہیں کر سکو گے، تو پھر وہی "ایک بیوی" کا اصول برقرار رہے گا۔

بات بالکل صاف ہے۔ "عدل" کے متعلق قرآن کریم نے آگے چل کر کہہ دیا کہ جہاں تک جذبات کا تعلق ہے، ان میں یکسانیت کا سلوک تو ناممکن ہے اس لئے تم اتنی احتیاط رکھو کہ کسی ایک کی طرف اتنا نہ جھک جاؤ کہ دوسری ادھر لٹکی رہ جائے۔ (۴/۱۲۹) ——— کہاں وہ بیوی جو تمہاری عمر بھر کی رفیقہ ہے۔ جس کی وجہ سے گھر جنت کا نمونہ بن رہا ہے۔ اور کہاں یہ، جسے تم معاشرہ کی ایک اجتماعی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جزو خاندان بنا رہے ہو۔ تمہارے جذبات دونوں کے ساتھ یکساں نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس سے یہ نہ ہو کہ یہ نو آمدہ ——— جو بے چاری پہلے ہی مصیبت زدہ۔ بے کس اور لاوارث ہے ——— نہ ادھر کی رہے نہ ادھر کی۔

پہلی بیوی کی رضامندی

یہ بھی ظاہر ہے کہ ان حالات میں بھی دوسری بیوی لانے کے لئے، پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہوگی اس لئے کہ

(i) قرآنِ کریم نے ازدواجی زندگی کا مقصد یہ بتایا ہے کہ میاں بیوی میں باہمی محبت اور رفاقت کے تعلقات ہوں اور گھر میں سکون و اطمینان رہے۔ ظاہر ہے کہ اگر دوسری شادی، پہلی بیوی کی مخالفت کے باوجود کی جائے، تو پہلی بیوی کے ساتھ محبت اور موانست کیسے رہ سکے گی اور گھر میں سکون و اطمینان کہاں باقی رہے گا؟ ایسا ہونا ناممکن ہے! اس لئے پہلی بیوی کی رضامندی کے بغیر دوسری بیوی لائی ہی نہیں جا سکتی۔ قرآن کا یہ منشاء نہیں کہ کسی اُجڑے ہوئے کنبہ کو آباد کرنے کے لئے، اپنے بستے رستے گھر کو ویران کر دیا جائے۔

(ii) قرآنِ کریم نے دوسری شادی کے لئے عدل کی شرط عائد کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب پہلی بیوی، دوسری شادی کی مخالفت کر رہی ہو، اور اس کی مخالفت کے علی الرغم دوسری بیوی گھر میں آ جائے، تو پہلی بیوی سے عدل کس طرح ہو سکے گا؟

(iii) قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اگر میاں بیوی میں ناچاقی ہو جائے تو ایک ثالثی بورڈ قائم کرو تاکہ ان دونوں میں مصالحت کرا دی جائے۔ اگر ان میں مصالحت نہ ہو سکے تو پھر نکاح فسخ کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب دوسری شادی، پہلی بیوی کی مخالفت کے باوجود کی جائے گی، تو (پہلے) میاں بیوی میں ناچاقی اُسی وقت شروع ہو جائے گی، اور اس ناچاقی کی وجہ وہ ہوگی (یعنی دوسری بیوی) جس کی موجودگی میں مصالحت کی کوئی صورت ہی نہیں ہو سکے گی۔ اس کی صورت یہی ہوگی کہ یا پہلی بیوی کو (ناحق) طلاق دے دی جائے، یا دوسری بیوی کو چھوڑ دیا جائے۔

یہ چیز کہ دوسری شادی کے لئے، پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہے، خود نبی اکرمؐ کے ایک ذاتی فیصلہ سے بھی ثابت ہے۔

> ایک دفعہ حضرت علیؓ نے دوسرا نکاح کرنا چاہا۔ آنحضرت (صلعم) کو معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئے۔ آپؐ نے مسجد میں خطبہ دیا۔ اس میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ فرمایا "میری لڑکی میرا جگر گوشہ ہے۔ جس سے اُسے دکھ پہنچے گا، مجھے اذیت ہوگی"۔ چنانچہ حضرت علیؓ اس ارادے سے باز آ گئے، اور حضرت فاطمہؓ کی زندگی تک دوسرا نکاح نہ کیا۔
>
> (سیرۃ النبیؐ علامہ شبلی - جلد دوم - ص ۶۲۷ - بحوالہ بخاری)

ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ نے جو کچھ اپنی بیٹی کے متعلق فرمایا اس کا اطلاق اُمت کی ہر بیٹی پر ہوگا۔ اس لئے جس دوسرے نکاح سے پہلی بیوی کو دکھ پہنچے وہ رسول اللہ کے اس فیصلہ کے مطابق بھی جائز نہیں قرار پا سکتا۔ کہا جائے گا کہ پہلی بیوی، دوسری شادی کی اجازت کیسے دے گی! سو پہلی بات تو یہ ہے کہ جن حالات کے پیشِ نظر قرآن نے دوسری شادی کی اجازت دی ہے، ان میں مومن عورتیں اپنی خانماں برباد، لاوارث، بے کس بہنوں کی امداد کے لئے یقیناً آگے بڑھ آئی ہوں گی (اور انہی جیسے حالات میں

ہیں مومن عورتوں سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ آگے بڑھیں گی)۔ علاوہ ازیں دوسری بیوی بھی، پہلی بیوی کے سر پر سوار ہونے کا جذبہ لے کر نہیں آئے گی۔ وہ اس کی ممنونِ احسان ہوگی۔

لیکن اس کے باوجود، اگر پہلی بیوی کسی وجہ سے، دوسری شادی کے حق میں نہیں، تو دوسری شادی کی اجازت نہیں ہو سکتی۔

بے شوہر کی عورتوں کا منصفانہ حل اسی صورت میں مل سکتا ہے جب وہ اس طرح جزوِ خاندان بنائی جائیں کہ گھروں کا امن و سکون قائم رہے اور پہلے میاں بیوی میں محبت اور رفاقت کا تعلق بدستور باقی رہے۔ اگر اس سے گھر جہنم بن جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ایک مشکل کا حل تلاش کرتے کرتے دس مشکلات اور پیدا کر لیں[1]۔

(۰)

دوسری شادی کے لئے، قرآنِ کریم میں صرف یہی ایک آیت ہے جسے اوپر درج کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دوسری شادی کے لئے تین شرطیں ضروری ہیں۔

اوّل۔ بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کے مسئلہ کی موجودگی۔

دوم۔ پہلی بیوی کی رضامندی۔ اور

سوم۔ عدل۔

حضورؐ کا اسوۂ حسنہ

اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی موجود نہیں تو قرآن کی رُو سے دوسری شادی کی اجازت نہیں۔ نہ ہی مقصدِ اوّل کے سوا کسی اور مقصد کے لئے دوسری شادی کی اجازت ہے۔ خود نبی اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔

(۱) حضورؐ نے پچیس سال کی عمر تک شادی نہیں کی اور ساری جوانی سپیدۂ سحر کی طرح بے داغ رہی۔

(۲) پچیس سال کی عمر میں ایک صاحبِ اولاد بیوہ سے شادی کی جن کی عمر اُس وقت چالیس سال کی تھی۔

(۳) جب تک وہ بیوی (حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ) زندہ رہیں حضورؐ نے دوسری شادی نہیں کی، حالانکہ ان کی عمر وفات کے وقت قریب پینسٹھ سال سے بھی زیادہ تھی۔ یعنی بیوی کی اس قدر عمر رسیدگی کے باوجود، دوسری شادی کا خیال تک نہیں کیا۔ (واضح رہے کہ اس وقت حضورؐ کی نرینہ اولاد بھی کوئی نہیں تھی ——— جو لڑکے پیدا ہوئے تھے وہ وفات پا چکے تھے)۔

(۴) حضرت خدیجہ رضؓ کی وفات کے بعد صرف ایک شادی ہے جو حضورؐ نے غیر شادی شدہ عورت (حضرت عائشہ رضؓ) سے کی۔ (اور وہ اس وقت جب ہنوز جنگوں کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا)۔ باقی

---

[1] اس مقالہ میں ازدواجی قوانین کے متعلق مختصر سی بحث کی گئی ہے۔ جو حضرات ان کی تفصیل معلوم کرنا چاہیں وہ پرویز صاحب کی کتاب "طاہرہ کے نام خطوط" کا مطالعہ فرمائیں۔ (سنہ ۱۹۸۰ء)

تمام نکاح، ان ہنگامی حالات میں ہوئے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، اور ان عورتوں سے جو (کئی کئی بار کی) بیوہ یا مطلقہ تھیں اور لاوارث و بے کس، بالعموم عمر رسیدہ۔ مقصد اس سے ان محتاجوں اور بے کسوں کی پناہ دہی تھی۔ چنانچہ باسورتھ سمتھ (BOSWORTH SMITH) اس باب میں لکھتا ہے کہ:۔

> محمدؐ کی شادیوں کی توجیہ جس طرح دیگر مقاصد کے تحت کی جا سکتی ہے، اسی طرح اس مقصد کے تحت بھی کہ اس سے کس مپرس، بے نوا افراد کے حالات پر ترس کھانا مقصود تھا۔ یہ شادیاں ان عورتوں سے ہوئیں جو قریب قریب سب کی سب بیوہ تھیں اور نہ اپنے حسن و جمال اور نہ مال و دولت کی بنا پر کوئی شہرت رکھتی تھیں۔ بلکہ صورتِ حالات اس کے بالکل برعکس تھی۔ (MOHAMMAD & MOHAMMADANISM)

باقی رہا یہ کہ ان شادیوں میں، پہلی ازواجِ مطہراتؓ کی رضامندی شامل ہوتی تھی۔ سو اس کا ثبوت یہ ہے کہ روایات کی رُو سے یہ (پہلی بیویاں) ہر نئی آنے والی بیوی کا خیر مقدم کرتی تھیں اور اسے مبارک باد دیتی تھیں۔ اگر یہ شادیاں ان کی مرضی کے خلاف ہوتیں تو وہ آنے والی کے استقبال اور مبارکباد کے لئے کبھی آگے نہ بڑھتیں۔*

عائلی قوانین

عائلی قوانین میں اگرچہ کہا گیا ہے کہ ثالثی کونسل کی منظوری کے بغیر دوسری شادی نہیں کی جا سکتی لیکن اس کے لئے صرف پہلی بیوی کی رضامندی کو شرط قرار دیا گیا ہے۔ قرآنی شرط (یعنی بے شوہر عورتوں وغیرہ کی کثرت کا) ذکر نہیں۔

لیکن ہمارے قدامت پسند طبقہ پر اتنی سی شرط بھی گراں گذر رہی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مرد کو بلا مشروط حق حاصل ہے کہ جب چاہے چار تک بیویاں کر لے۔ اس کے اس حق پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنا! "شریعت" کے خلاف ہے۔

چار بیویوں کے علاوہ وہ لونڈیاں رکھنے کا حق بھی برقرار رکھنا چاہتے ہیں (ایک صاحب نے اسمبلی میں اس کا مطالبہ بھی پیش کر دیا تھا۔ ۱۹۸۰ء)

(۰)

۶۔ وراثت عائلی قوانین میں ایک شق یہ بھی ہے کہ

---

* ہم نے اس جگہ اور دیگر مقامات پر حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ان روایات کو ہم اس لئے صحیح مانتے ہیں کہ وہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہیں۔ یہی روایات کے صحیح یا غلط ہونے کا ہمارے نزدیک بنیادی معیار ہے۔

اگر وراثت کے شروع ہونے سے پہلے، مورث کے کسی لڑکے یا لڑکی کی موت واقع ہو جائے تو ایسے لڑکے یا لڑکی کے بچوں کو (اگر کوئی ہوں) بحصّہ رسدی وہی ملے گا جو اس لڑکے یا لڑکی کو (جیسی کہ صورت ہو) زندہ ہونے کی صورت میں ملتا۔

یہ بات حسبِ ذیل نقشہ سے سمجھ میں آسکے گی:-

زید

بکر (زید کا بیٹا) — عمر (زید کا بیٹا)

رشید (زید کا پوتا) — حامد (زید کا پوتا)

اگر زید کی زندگی میں بکر فوت ہو جائے تو رشید یتیم رہ جائے گا۔ اس کے بعد جب زید کی وفات ہوگی تو، حضراتِ علمائے کرام کے ارشاد کے مطابق، زید کی جائداد میں سے رشید (یتیم پوتے) کو کچھ نہیں ملے گا۔ ساری جائداد عمر کو مل جائے گی۔ رشید اپنے دادا کی جائداد سے اس لئے محروم کر دیا گیا کہ وہ بیچارا یتیم رہ گیا تھا!

عائلی قوانین میں کہا گیا ہے کہ (یہ اس یتیم کے ساتھ بڑی بے انصافی ہے) ۔ زید کی وفات پر رشید کو وہی حصّہ ملنا چاہیئے جو اس کے باپ کو ملتا۔ یہ قانون، قرآنِ کریم کی تعلیم کے مطابق ہے۔ اس سلسلہ میں ہم تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔ لیکن ہمارے مولوی صاحبان اس کے بھی سخت مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ زید کے ترکہ سے اس کے یتیم پوتے کو کچھ نہیں ملنا چاہیئے۔ (خواتین کی حالیہ کانفرنس میں ایک (مرد) مقرر نے بھی یتیم پوتہ کے حقِ وراثت کی مخالفت کی تھی ــــ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا الیہ راجعون ــــ "دی مسلم"۔ ۲۸ راکتوبر ۱۹۸۰ء)۔

(-)

یہ ہیں عائلی قوانین اور یہ ہے ان کی مخالفت کی تفصیل۔ اس مقام پر ہر صاحبِ عقل و بصیرت کے دل میں یہ خیال ابھرے گا کہ جب یہ قوانین قرآنِ مجید کے بھی خلاف نہیں، اور فہم و تدبر کی رُو سے بھی معقول نظر آتے ہیں، تو پھر ان کی مخالفت کس بنا پر کی جاتی ہے؟ اس کے لئے آپ ایک بنیادی حقیقت کو سمجھ لیں گے تو نہ صرف زیرِ نظر مسئلہ، بلکہ مذہب کے جملہ مسائل حل ہو جائیں گے۔ ہمارے علماء حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ فقہ کے قوانین (جو آج سے ہزار بارہ سو سال پہلے مرتب ہوئے تھے) ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ بالفاظِ دیگر یہ ہمیشہ قوانینِ شریعت کی حیثیت سے نافذ رہیں گے اور ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکے گا۔ اور ظاہر ہے کہ جب ان میں تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکتا تو پھر ان پر غور و خوض کرنے یا انہیں پرکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ان کا عقیدہ ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو بات کسی کے عقیدہ کے خلاف ہو، وہ اس سے متفق نہیں

ہوسکتا۔ یہ ہے بنیادی وجہ ان کی مخالفت کی۔ کسی عقیدہ کا تعلق اگر کسی کی پرائیویٹ زندگی تک محدود ہو تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا۔ لیکن اگر عقیدہ قانونِ شریعت کی حیثیت اختیار کرلے تو پوری کی پوری قوم اس سے متاثر ہوگی، اور ان میں، اور ان لوگوں میں جو اس عقیدہ میں ان سے متفق نہیں، باہمی نزاع پیدا ہوگی۔ قوم میں جو اختلاف، افتراق، انتشار اور اس سے آگے بڑھ کر، تنازعات اور فسادات برپا ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس سوال کا تعلق محض عائلی قوانین سے نہیں۔ یہ سوال ہماری زندگی کے تمام شعبوں اور گوشوں کو محیط ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ حکمرانی کتاب اللہ کی ہوگی یا انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی؟

سوال جس قدر اہم ہے (بحالاتِ موجودہ) اسی قدر مشکل بھی ہے۔ اس کا صحیح جواب وہی دے سکے گا جو (اقبالؒ کے الفاظ میں) روحِ عمرؓ کو لے کر آگے بڑھے اور پورے عزم اور ہمت کے ساتھ کہے کہ

حسبنا کتاب اللہ
حکمرانی خدا کی کتاب کی ہوگی۔

(۰)

ایک ضروری وضاحت

اشاعت زیرِ نظر میں پرویز صاحب کا ایک مبسوط مقالہ بعنوان "کیا قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟" شائع ہو رہا ہے۔ یہ مقالہ پہلے روزنامہ نوائے وقت کی ۱۷ اکتوبر کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ پرویز صاحب نے اس میں کچھ لفظی تغیرات اور چند ایک اضافے کئے ہیں جن سے یہ مقالہ، نوائے وقت میں شائع شدہ مقالہ سے قدرے مختلف ہوگیا ہے۔ بایں ہمہ ہم اسے نوائے وقت کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ اس مقالہ کا ایک الگ پمفلٹ بھی شائع کیا گیا ہے۔ (ناظم ادارہ)

بقیہ صفحہ ۸ سے آگے

بہاولپور میں (بذریعہ ٹیپ) ہر جمعہ
باہتمام ڈاکٹر (ہومیو) محمد اعظم خان صاحب
۱۔ ۸ بجے صبح۔ عثمانی خیراتی شفاخانہ غنی پور
۲۔ ۳ بجے سہ پہر بعد نماز جمعہ بمکان اعظم منزل۔ مچھلی بازار

کوئٹہ میں (بذریعہ ٹیپ) باقاعدگی سے ہفتہ وار
رابطہ کے لئے:۔
ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر، توغی روڈ پر
محترم غلام صابر صاحب سے رجوع فرمائیں

باسمہٖ تعالیٰ

کیا قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟

(بتقریب یومِ پیدائش قائدِ اعظمؒ)

دسمبر ۱۹۸۰ء

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

کیا قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟

سالِ گزشتہ محترم محمد منیر (ریٹائرڈ) چیف جسٹس آف پاکستان کی کتاب (FROM JINNAH TO ZIA) شائع ہوئی تھی۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے اس سابقہ خیال کو دہرایا ہے کہ ـــــ قائدِ اعظمؒ پاکستان میں سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے ـــــ محترم محمد منیر نے ۱۹۶۴ء میں روزنامہ "پاکستان ٹائمز" میں ایک مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا (DAYS TO REMEMBER) اس کے آخر میں انہوں نے لکھا تھا:-

> تشکیلِ پاکستان کے وقت کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہو گی۔

طلوعِ اسلام بابت اگست۔ ستمبر ۱۹۶۴ء میں اس کا مؤاخذہ کیا گیا تھا۔ میں نے محترم جسٹس کی کتاب کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا کیونکہ میرے خیال میں یہ بات کہنا کہ قائدِ اعظمؒ پاکستان میں سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے ایسا ہی ہے کہ جیسے کل کو کوئی مؤرخ یہ لکھ دے کہ قائدِ اعظمؒ لنگوٹ باندھ کر مسٹر گاندھی کی پیراں تھامیں جایا کرتے تھے۔ یعنی بدیہیات کو جھٹلانا۔

لیکن میرے ایک بالغ نظر دوست نے مجھ سے کہا ہے کہ محترم جسٹس کی اس کتاب سے پاکستان کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے۔ وہ طبقہ جو شروع ہی سے پاکستان کے قیام کے خلاف تھا، ہمارے نوجوان طبقہ میں یہ خیال عام کر رہا ہے کہ قائدِ اعظمؒ کا مقصد اس مملکت کو سیکولر بنانا تھا۔ اس کی تائید میں وہ محترم جسٹس کی کتاب کو بطور سند پیش کرتا ہے۔ اور چونکہ محترم جسٹس کے نام کو ان کے سابقہ منصب اور بزرگی کے اعتبار سے خاص اہمیت حاصل ہے اس لئے یہ پروپیگنڈہ خاصا اثر انداز ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس طبقہ میں یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ جب پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا مقصود تھا تو

ہندوستان سے الگ ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ میرے دوست نے مجھ سے کہا کہ اس کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔ میں نے اس سے اتفاق کیا۔ ان سطور کا جذبۂ محرکہ یہی ہے۔ میں اس سلسلے میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں بالعموم اور قائدِ اعظمؒ کے ضمن میں بالخصوص، جو کچھ میں کہتا چلا آرہا ہوں اور کہوں گا، وہ شنید نہیں، دید ہے۔ میں (اپنے متعلق اکثر کہا کرتا ہوں کہ میں) ۱۹۳۰ء کا پاکستانی ہوں، جب علامہ اقبالؒ نے (الہ آباد کے مقام پر) اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ اسلام ایک زندہ حقیقت صرف اپنی آزاد مملکت میں بن سکتا ہے، اور اس مقصد کے لئے انہوں نے مسلمانانِ ہند کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا تھا۔ اس کے بعد جب قائدِ اعظمؒ اس شمع کو لے کر آگے بڑھے تو میں نے ملازمت میں ہونے کے باوجود تقریباً دس سال تک ان کی معیت اور قیادت میں اپنے انداز سے تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ اس زمانہ کے طلوعِ اسلام کے فائل اس کے شاہد ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد، طلوعِ اسلام ۱۹۴۸ء میں جاری ہوا، اور وہ پاکستان کی اصل و اساس کے تحفظ کے سلسلہ میں، جس کثرت اور شدت سے لکھتا چلا آرہا ہے، شاید ہی کوئی پاکستانی ایسا ہو جو اس سے ناواقف ہو۔ بنابریں، میں اس سلسلہ میں جو کچھ عرض کروں گا وہ شنید نہیں، دید ہوگا۔ لیکن "دید" سے یہ مراد نہیں کہ میں زبانی روایات پیش کر دوں گا۔ بلا سند زبانی روایات سے تو تاریخ مسخ ہو جاتی ہے۔ میں جو کچھ کہوں گا وہ قائدِ اعظمؒ کے ان بیانات، اور تقاریر پر مبنی ہوگا جو چھپ کر محفوظ ہو چکی ہیں اور انہیں ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے۔

محترم جسٹس نے اپنے دعاوی کو ان الفاظ میں سمیٹ کر بیان کیا ہے:

۱۔ قائدِ اعظمؒ سیکولر ڈیموکریٹک مملکت چاہتے تھے۔ یعنی ایسی سٹیٹ جس میں مذہب کو کاروبارِ مملکت سے کچھ واسطہ نہ ہو۔ (ص ۳۲)

۲۔ پاکستان میں ایک مذہبی مملکت کے قیام کا خیال نہ علامہ اقبالؒ کے ذہن میں تھا نہ قائدِ اعظمؒ کے (ص ۳۴)

۳۔ اسلامی مملکت کا تصور قائدِ اعظمؒ کی وفات کے بعد پہلی بار ۲۵ مارچ ۱۹۴۹ء کو لیاقت علی خاں (مرحوم) نے قرار دادِ مقاصد کی شکل میں اسمبلی میں پیش کیا۔ انہوں نے اس قرار داد کو قائدِ اعظمؒ کی زندگی میں اس لئے پیش نہ کیا کہ وہ جانتے تھے کہ وہ اس کی سخت مخالفت کریں گے۔ (ص ۳۶)

اپنے اس دعوے کی تائید میں محترم نے دو دلائل پیش کئے ہیں:-

۱۔ قائدِ اعظمؒ نے بار بار کہا تھا کہ پاکستان میں تھیاکریسی نہیں ہوگی۔ (ص ۳۰، ص ۳۲، ص ۳۵) اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سیکولر سٹیٹ چاہتے تھے۔

۲۔ انہوں نے اپنی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر میں اسے واضح کر دیا تھا کہ پاکستان کی مملکت سیکولر ہوگی۔ (ص ۳۰)

قبل اس کے کہ میں واضح کروں کہ قائدِ اعظمؒ پاکستان میں کس قسم کی سٹیٹ چاہتے تھے، میں (جسٹس ممدوح کی بزرگی کے احترام کے باوجود) اتنا گزارش کرنے پر مجبور ہوں کہ ان کی یہ دلیل کہ چونکہ قائدِ اعظمؒ تھیاکریسی نہیں چاہتے

تھے۔ اس لئے اس سے ثابت ہوا کہ وہ سیکولر سٹیٹ چاہتے تھے، بڑی رکیک اور بودی ہے۔ تھیاکریسی اسی طرح خلافِ اسلام ہے جس طرح سیکولرازم۔ لہٰذا قائدِاعظمؒ جس طرح سیکولرازم کے خلاف تھے، اسی طرح تھیاکریسی کے بھی خلاف تھے۔ تھیاکریسی کہتے کسے ہیں؟ اسے انہوں نے اپنے اس پیغام میں واضح کر دیا تھا جو انہوں نے بحیثیتِ گورنر جنرل، فروری ۱۹۴۸ء میں اہلِ امریکہ کے نام براڈ کاسٹ کیا تھا۔ اس میں انہوں نے پاکستان کے دستور کے متعلق فرمایا تھا:-

> پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری نمونہ کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ امر مسلّمہ ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔
>
> (تقاریر بحیثیتِ گورنر جنرل۔ ص۶۵)

تھیاکریسی کی مخالفت

اس براڈ کاسٹ کے آخری فقرہ میں قائدِاعظمؒ نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ تھیاکریسی وہ نظامِ حکومت ہوتا ہے جس میں اقتدار مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ قائدِاعظمؒ اس طرزِ حکومت کے خلاف تھے کیونکہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ اور قرآن آیا ہی اسے مٹانے کے لئے تھا۔

مجھے انتہائی افسوس بلکہ دکھ کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ محترم جسٹس نے اپنی کتاب میں قائدِاعظمؒ کے اس براڈ کاسٹ کو نقل کیا ہے لیکن اس فقرہ تک کہ "ہم ان کا پورا پورا احساس رکھتے ہیں"۔ اس کا اگلا فقرہ جس میں قائدِاعظمؒ نے واضح کیا تھا کہ تھیاکریسی کیا ہوتی ہے انہوں نے حذف کر دیا ہے۔ (کتاب ص۳۱، ص۳۰) ان کی بزرگی کا احترام ہمیں اس باب میں کچھ کہنے سے مانع ہے۔ عدالت کی میزان میں اسے کیا کہا جائے گا، اس کے متعلق ان سے بہتر فیصلہ اور کون دے سکے گا۔

اقبالؒ کی طرح قائدِاعظمؒ بھی تھیاکریسی کے خلاف تھے اور سخت خلاف۔ اس لئے کہ تھیاکریٹک سٹیٹ اور اسلامک اسٹیٹ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے تھیاکریسی کے خلاف کیا کچھ اور کتنا کچھ لکھا تھا، اس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں۔ (میں اس مقالہ کو جسٹس ممدوح کی کتاب کے حوالے سے قائدِاعظمؒ تک محدود رکھنا چاہتا ہوں) یہاں ان کے صرف ایک بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے جو روزنامہ انقلاب

(لاہور) کی ۲۳ مارچ ۱۹۳۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا اور جس میں انہوں نے قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:-

> تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند فطرتی، ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات وجذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی اُمنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

انہوں نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اس قسم کا انقلاب بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی ہوگا۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا کہ "اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریّت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ —— "حسبنا کتاب اللہ" —— ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔" (خطباتِ اقبالؒ)

قائدِ اعظمؒ نے ۵ فروری ۱۹۳۸ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے، نوجوان طالب علموں سے کہا تھا کہ "مسلم لیگ نے ایک کام تو کر دیا اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں .... رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خود غرضی کا مفاد پرستانہ کھیل کھیل رہے ہیں وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اس نے تمہیں اس ناپسندیدہ عنصر کی جکڑبندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔" (تقاریرِ قائدِ اعظمؒ۔ حصہ اوّل۔ صفحہ ۴۸) اس سے ان کی مراد، تھیاکریسی کی مخالفت تھی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے ۱۱ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:-

> اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ جنگ کر رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔
>
> (تقاریرِ جناحؒ۔ شائع کردہ۔ شیخ محمد اشرف۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۸۶)

اِسلامی حکومت کی امتیازی خصوصیّات

وہ تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بلکہ اسلامک سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ اسلامک سٹیٹ کے اصول ومبانی کیا ہوتے ہیں یہ موضوع بڑی تفصیل چاہتا ہے (میں اس کے متعلق صدہا صفحات لکھ چکا ہوں) اس کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ اس میں کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو انہوں نے حیدرآباد

(دکن) میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کو ۱۹۴۱ء کو انٹرویو دیتے ہوئے ایسے جامع انداز میں سمٹا کر بیان کر دیا تھا جس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ انہوں نے فرمایا تھا:-

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

(اورینٹ پریس بحوالہ روزنامہ انقلاب، لاہور مورخہ ۸ر فروری ۱۹۴۲ء)[1]

ہمیں امید ہے کہ اس سے محترم جسٹس پر یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ قائدِ اعظمؒ مغیا کریسی کی مخالفت کے بعد کس قسم کا سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے۔

مطالبۂ پاکستان کا مقصد

اب آیئے اس حقیقت کی طرف کہ وہ مقصد کیا تھا جس کے حصول کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا اور قائدِ اعظمؒ اور مخالفینِ مطالبۂ پاکستان کے مابین جنگ کس بات پر ہوئی تھی؟ وہ جنگ صرف اس بنا پر لڑی گئی تھی کہ قائدِ اعظمؒ اسلامی ریاست متشکل کرنا چاہتے تھے اور مخالفینِ پاکستان (ہندو اور مسلمان نیشنلسٹ) سیکولر سٹیٹ کے حامی تھے۔ تفصیل اس اجمال کی بڑی وسعت طلب ہے۔ میں چند ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا ——

قائدِ اعظمؒ نے جب مذہب (دین) کی بنیادوں پر مملکت قائم کرنے کا مطالبہ پیش کیا تو (اس زمانے کے) کانگریس کے ایک نامور لیڈر، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی، نے ایوانِ اسمبلی میں (جس میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے) پکار کر کہا:-

اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو، وقت آچکا ہے کہ ہم اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام، یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصرِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد، معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔ (ہندوستان ٹائمز۔ ۵/۹/۱۹۳۸ء)

---

[1] اس وقت میرے سامنے طلوعِ اسلام اپریل، مئی ۱۹۴۲ء کا شمارہ ہے جس میں پہلی بار یہ انٹرویو شائع ہوا تھا۔

اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا تھا:۔

حکومتِ الٰہیہ کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعل عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئندہ ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمہ دار رہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔

(ہندوستان ٹائمز، ۳۹-۱۱-۱۴)

۱۹۴۰ء میں جب قراردادِ پاکستان منظور ہوئی تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر گاندھی نے کہا تھا:۔

اگر مذہب کو علیحدہ رہنے دیا جائے یعنی ایک شخص کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق، تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہِ عمل بھی مشترک ہو۔

(ہندوستان ٹائمز، ۴۰-۶-۹)

اسی رَو میں مسٹر گاندھی نے ۱۹۴۶ء میں لکھا تھا:۔

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ؟ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے ..... مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔ (ہریجن، ۱۹۴۶-۱۲-۹)

مسٹر گاندھی کا یہ ردِ عمل، قائدِ اعظمؒ کے اس خط کا نتیجہ تھا جو انہوں نے آں الذکر کو یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے (مسٹر گاندھی سے) کہا تھا:۔

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے، لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے۔ اور وہ کونسی قوتِ محرکہ ہے جو آپ کو آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح؟ تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔ (لہٰذا، مذہب اور سیاست، دو الگ الگ شعبے ہو نہیں سکتے) آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو انسانی معاملات سے واسطہ نہیں، میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ زندگی انسانی نہیں، محض غوطہ آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے، لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔

(تقاریر جناحؒ۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۲۰-۱۳۹)

قرآنِ مجید کی عظمت

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اسلامی مملکت وہ ہے جس میں قرآنِ عظیم کی حکمرانی ہو۔ انہوں نے قرآنِ مجید کی عظمت اور جامعیت کا کسی ایک بیان میں ذکر نہیں کیا، وہ پوری تحریکِ پاکستان کے دوران اس حقیقت کو دہراتے رہے۔ مثلاً اپریل ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے صوبہ سرحد کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائدِ اعظمؒ سے ایک پیغام کے لئے درخواست کی۔ آپ نے جواب میں فرمایا:۔

تم نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں کوئی پیغام دوں۔ میں تمہیں کیا پیغام دوں جبکہ ہمارے پاس پہلے ہی ایک عظیم پیغام موجود ہے جو ہماری راہنمائی اور بصیرت افروزی کے لئے کافی ہے۔ وہ پیغام ہے خدا کی کتاب عظیم، قرآنِ کریم۔ (تقاریر۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۵۱۶)

۱۳ نومبر ۱۹۳۹ء کو آپ نے قوم کے نام عید کا پیغام نشر فرمایا۔ اس زمانے میں ملک میں ہنگامے اور فساد ہو رہے تھے۔ آپ نے قوم سے کہا:۔

جب ہمارے پاس قرآنِ کریم ایسی مشعلِ ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکتے؟ (تقاریر۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۰۸)

دسمبر ۱۹۴۳ء میں کراچی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے خود ہی سوال اٹھایا۔

وہ کونسا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں، وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے، وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس اُمت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟

اس کے بعد خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا!

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی عظیم کتاب قرآنِ مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول۔ فلہٰذا ایک قوم۔ (تقاریر جلد دوم۔ صفحہ ۵)

انہوں نے ۱۹۴۵ء میں، ملت کے نام عید کے پیغام میں ایک ایسی حقیقت کشا بات کہی جس پر نگہِ بصیرت ہمیشہ وجد کرتی رہے گی۔ آپ نے فرمایا:۔

اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور مؤرخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "بحرِ اطلانٹک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط

ہیں اور یہ قوانین غیر متبدل، منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔"

اس کے بعد قائدِ اعظمؒ فرماتے ہیں:-

> اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی تقاریب ہوں یا روزمرہ کے معمولات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا۔ ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآن کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔ (انہیں الگ مذہبی پیشواؤں کی ضرورت نہیں)۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۱)

حیدر آباد (دکن) کے جس انٹرویو کا ذکر پہلے آ چکا ہے، اس میں جب طلباء نے یہ سوال کیا کہ "مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟" تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا تھا:-

> جب میں انگریزی زبان میں مذہب (RELIGION) کا لفظ سنتا ہوں[ط] تو اس زبان اور محاورے کی رُو سے، میرا ذہن لامحالہ خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلام کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریقِ عمل نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے، اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔

انہوں نے اپنی اس پکار کو اس شد و مد سے دہرایا کہ ہندوستان کا بچہ بچہ اس سے واقف ہو گیا کہ قائدِ اعظمؒ کس قسم کی مملکت بنانا چاہتے ہیں۔

دشمنوں کی گواہی

یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت ہندوؤں کے مشہور رہنما،

ط ہمارے ہاں وقت یہ پیش آ جاتی ہے کہ قرآن کریم میں اسلام کے لئے دین کا لفظ آیا ہے اور لفظ دین کے لئے انگریزی زبان میں کوئی لفظ نہیں۔ ان کے ہاں صرف (RELIGION) کا لفظ ہے جس کے معنی مذہب ہیں، دین نہیں۔

مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:۔

تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے کہ پاکستان کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنالیں جہاں طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکے۔ اور جہاں اُردو اُن کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔
(ٹریبیون ۔ ۱۹۴۱ - ۱۱ - ۲)

ضمناً۔ اوائل ۱۹۷۷ء کا ذکر ہے۔ جرمنی میں پاکستان ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام، قائدِ اعظم کے جشنِ صد سالہ کی ایک تقریب منائی گئی۔ اس میں ایک جرمن سکالر، پروفیسر ڈاکٹر (KRAHNAN) نے اپنی تقریر کے دوران کہا تھا:۔

قائدِ اعظم محمد علی کے سامنے ماڈل، قرآنِ مجید تھا۔
(پاکستان ٹائمز، ۳ رفروری ۱۹۷۷ء)

یعنی بھارت کے مسٹر منشی اور جرمنی کے سکالر تک تو جانتے تھے کہ قائدِ اعظم کس قسم کی مملکت بنانا چاہتے تھے لیکن نہیں جانتے تھے تو ہمارے محترم جسٹس محمد منیر صاحب!

بوٹا بوٹا پتہ پتہ، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے، گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

قائدِ اعظم کی وفات کے بعد، ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۹ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا تھا:۔

پاکستان بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف و ہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس حقیقت سے کہ پاکستان کے رہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول و روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد اس نے اس مقالہ افتتاحیہ میں کہا:۔

اگر کشمیر کا مسئلہ پُر امن طریقے سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامی سٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

کیا محترم جسٹس منیر صاحب نے اندازہ فرمایا ہے کہ قائدِ اعظم اور مخالفین میں باعثِ نزاع کیا مسئلہ تھا؟ یہ مسئلہ کہ قائدِ اعظم اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ اور مخالفین سیکولر سٹیٹ پر زور دیتے تھے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ہندو تو اس کے لئے بھی تیار تھا کہ اگر پاکستان اسلامی سٹیٹ بنانے کے دعوے کو ترک کر دے تو وہ اس کے ساتھ مفاہمت کر لے گا۔

ہم نے پہلے کہا ہے کہ قائدِ اعظم کی طرف سے پیش کردہ مطالبۂ پاکستان کی مخالفت، ہندو نے بھی کی تھی اور

قومیت پرست مسلمان لیڈروں نے بھی - ان میں سرِفہرست نیشنلسٹ علماء کا طبقہ تھا - اگر ان کی بنا مخالفت سامنے آجائے تو اس سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قائدِ اعظمؒ کس قسم کی مملکت قائم کرنا چاہتے تھے اور ان کے مخالفین کس قسم کی؛ یہ مخالف علماء باستثنائے چند دارالعلوم دیوبند کے مسلک سے متعلق تھے۔ دیوبند کا مسلک کیا تھا، اس کے متعلق متحدہ ہندوستان کے مشہور نیشنلسٹ اخبار مدینہ (بجنور) کی سترہ اپریل ۱۹۴۳ء کی اشاعت میں مولانا اسرار احمد آزاد دیوبندی کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا:-

> یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علماءِ ہند اس ملک میں اسلامی حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔

یہ ایک مثال ہی اس حقیقت کے ثبوت کے لئے محکم دلیل ہے کہ یہ حضرات سیکولر حکومت کے قائل تھے اور قائدِ اعظمؒ اس طرزِ حکومت کے مخالف۔ اور یہی ان دونوں میں بنائے مخاصمت تھی۔ سیکولر نظامِ حکومت سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس میں ہر اہلِ مذہب کو اعتقادات، عبادات، رسوم و رواج اور شخصی قوانین (پرسنل لاز) کی آزادی حاصل ہو۔ اور امورِ مملکت میں مذہب کو کوئی دخل نہ ہو۔ یہ تھی وہ سیکولر حکومت جس کے داعی نیشنلسٹ علماء تھے۔ اُس زمانے میں اس گروہ کے سرخیل، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمعیت العلماء ہند کے صدر (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے۔ ان کا ارشاد تھا:-

> ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لئے سب کو متحدہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی، اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت ہے۔

(زمزم، مورخہ ۷ر جولائی ۱۹۳۸ء)

وہ فرماتے تھے:-

> کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ پہنچے۔

(مولانا مدنی کا پمفلٹ - متحدہ قومیت اور اسلام - ص۴۱)

اس کے برعکس، جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، قائدِ اعظمؒ کا موقف یہ تھا کہ اسلام میں مملکت کی بنیاد مذہب پر ہوتی ہے، اس لئے ان علماء کا یہ مسلک اسلام کے خلاف ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
نادان یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

قائدِ اعظمؒ اور ان علماء کے اختلاف کی شدت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر فرما دیا تھا اور مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو حرام قرار دیدیا تھا۔ اس فتویٰ کا جواب (مولانا) شبیر احمد عثمانی نے اپنے ایک مکتوب میں دیا تھا، (رہبرِ دکن" ۱۹ر اکتوبر ۱۹۴۵ء)

۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر

اب آیئے قائدِ اعظمؒ کی ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کی طرف، جسے یہ حضرات تُرپ کے پتے کے طور پر استعمال کیا کرتے ہیں اور جس پر محترم جسٹس محمد منیر صاحب نے بھی اپنے دعوے کی بنیاد رکھی ہے، اور اتنا کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے بلکہ یہاں تک کہنے میں بھی کچھ باک نہیں سمجھا کہ انہوں نے دو قومی نظریہ کو بھی ختم کر دیا تھا۔ یعنی اتنا ہی نہیں کہ انہوں نے اسلامی مملکت کے تصوّر کی نفی کر دی تھی، بلکہ سرے سے اس بنیاد ہی کو منہدم کر دیا تھا جس پر تقسیمِ ہند کی عمارت استوار ہوئی تھی۔ اس تقریر کے سلسلہ میں بات یوں ہوئی کہ جب قائدِ اعظمؒ کو پاکستان کی پہلی مجلسِ آئین ساز اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے (۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کو) اس مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے ایک تقریر فرمائی۔ اس میں انہوں نے پہلے، قبل از تقسیم کے ہندوستان کے کوائف و حوادث پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قدر باہمی عداوت کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ وہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندو اکثریت میں، اس لئے وہاں ہمیشہ مسلمانوں کا خون خرابہ ہوتا تھا ـــــ پاکستان میں صورتِ حال اس کے برعکس ہوگی۔ یہاں مسلمان اکثریت میں ہوں گے اور ہندو اقلیت میں، اس لئے ہندوؤں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اب یہاں ان کے ساتھ وہی کچھ ہوگا جو کچھ وہ وہاں مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ویسے بھی ہندو مؤرخوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ حکومت کا ایسا بھیانک اور وحشت انگیز نقشہ کھینچ رکھا ہے جس سے ہندو عوام خوف و ہراس سے کانپ اٹھتے ہیں۔

بنا بریں یہاں کا ہندو اس لئے بھی خائف ہو سکتا تھا کہ اب یہاں جو مسلمانوں کی حکومت قائم ہو رہی ہے تو ماضی کی تاریخ کو یہاں بھی دہرایا جائے گا۔ ہم ہندوستان ٹائمز کا اقتباس پہلے درج کر چکے ہیں جس میں اس نے کہا تھا کہ پاکستان کے ہندوؤں کے دل میں یہی خطرہ لاحق تھا۔ ان تاثرات کو سامنے رکھتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے اپنی اس تقریر میں ہندوؤں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان میں ایسا نہیں ہوگا۔ انہوں نے جملہ اہلِ پاکستان کو مخاطب کر کے فرمایا:-

> تم آزاد ہو، تمہیں اس امر کی کامل آزادی ہے کہ تم اپنے مندروں میں جاؤ یا مسجدوں میں، یا مملکتِ پاکستان میں کسی اور پرستش گاہ میں، تمہاری ذات یا مسلک کچھ بھی ہو، اس کا امورِ مملکت سے کچھ تعلق نہیں ہوگا۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ (اور تو اور) انگلستان کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہاں عیسائیوں ہی کے دو فرقوں ـــــ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ـــــ میں کس قدر کشت و خون ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس مملکت نے، اپنی کامل ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے، رفتہ رفتہ ان منافشات کو مٹا دیا۔ اور "اب تم پورے انصاف سے کہہ سکتے ہو کہ وہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ نہیں، بلکہ ایک مملکت کے شہری بستے ہیں"۔

اسی طرح :-

> میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے یہ نصب العین رکھنا چاہیئے کہ ایک وقت کے بعد یہاں نہ ہندو، ہندو رہے گا، نہ مسلمان، مسلمان ——— مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں، کیونکہ وہ تو ہر فرد کے ذاتی عقیدہ کا سوال ہے۔ ایسا، ان سب کے پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے، سیاسی نقطۂ نگاہ سے ہوگا۔

یہ ہیں قائداعظمؒ کے وہ الفاظ جنہیں سپر بنا کر یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تشکیل پاکستان کے فوری بعد دو قومی نظریہ کو بھی خیرباد کہہ دیا تھا اور اسلامی مملکت کے تصور کی تردید کر کے اسے سیکولر بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اگر قائداعظمؒ کہیں مریخ سے ٹپکے ہوتے اور انہوں نے پہلے پہل یہ الفاظ کہے ہوتے تو اس تقریر سے اس قسم کے استنباط کا شائبہ ہو سکتا تھا۔ لیکن جس شخصیت کی دس سالہ (تحریکِ پاکستان کی) زندگی اور اس دوران میں اس کے صدہا صفحات پر مشتمل بیانات، تقاریر، خطابات ہمارے سامنے ہوں، اس کی طرف ان نتائج کو منسوب کرنا جس قدر زیادتی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب ان لوگوں سے اس دلیل کا جواب نہیں بن پڑتا تو وہ (نہایت دیدہ دلیری سے) کہہ دیتے ہیں کہ بے شک قائداعظمؒ دس سال تک یہ دعویٰ کرتے رہے لیکن وہ درحقیقت ایک وکیلانہ حربہ تھا جسے انہوں نے اپنا مقدمہ جیتنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ جب کیس کا فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا تو اس حربہ کی ضرورت نہ رہی۔ ایسا کہنے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ یہ کچھ وہ کس شخص کے متعلق کہہ رہے ہیں؟ ہم برینائے عقیدت نہیں کہتے، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ جو شخص قائداعظمؒ کے کیریکٹر کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے، وہ ان کے خلاف اس قسم کا الزام عائد کرنے کی جرأت کبھی نہیں کر سکتا۔ حق گوئی اور بے باکی ان کے کردار کی ایسی خصوصیت تھی جس کا اعتراف ان کے دشمنوں تک کو تھا۔ لندن ٹائمز نے ان کی وفات پر لکھا تھا :-

> قائداعظمؒ نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ کے طور پر پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ لچک نہیں تھی جو انگریزوں کے نزدیک، ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت، واضح اور شفاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی۔

قائداعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ انہوں نے جب مجلس آئین ساز سے خطاب کیا تھا تو ملک کے حالات کیا تھے۔ (جیسا کہ محترم جسٹس نے خود اپنی کتاب میں تسلیم کیا ہے) تقسیم ہند کے ساتھ ہی ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں، مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا تھا۔ اس سے وہاں کے مسلمانوں کے دل میں خوف و دہشت کے ایسے جذبات ابھرے کہ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ پاکستان میں آ کر پناہ لے لیں۔ لیکن ان وحشی درندوں نے ان لٹے قافلوں کو بھی نہ چھوڑا۔ راستہ بھر قتل و غارت گری کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ ان کی نوجوان لڑکیوں کو ہزاروں کی تعداد میں چھین جھپٹ کر لے گئے۔ ان کے معصوم بچوں کو نیزوں کی انیوں پر اچھالا گیا۔ اور تو اور، دِلّی سے جو گاڑیاں خود

حکومت کے عملہ کو لے کر روانہ ہوئیں۔ (میں بھی انہیں میں شامل تھا) یہاں پہنچنے پر ان میں سے زندہ انسانوں کی بجائے لاشوں کے ٹکڑے برآمد ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان وحشیانہ مظالم کا ردِّ عمل پاکستان کے بعض حصّوں میں بھی ہوا۔ اور اس سے یہاں کے غیر مسلم باشندوں (بالخصوص ہندوؤں) کے دل میں خوف و ہراس، بے اعتمادی، اور بے یقینی کے وساوس پیدا ہوئے۔ آپ سوچئے کہ ایک ایسی مملکت جس کی عمر ابھی ایک دن کی بھی نہ ہوئی ہو، اس قسم کے لرزہ خیز حالات سے دوچار ہو۔ پھر اس کی کیفیت یہ ہو کہ اس کے پاس (ابھی) نہ اپنی فوج ہو، نہ اسلحہ، نہ سامان ہو نہ پیسہ، تو اس کے سربراہ کے دل پر اس سے کیا نہ گزرتی ہو گی؟ اس کے ساتھ اسے بھی ذہن میں رکھیئے کہ پاکستان کے اندر خود ایسے عناصر موجود تھے جو ایک طرف یہاں کے غیر مسلموں کے دل میں خوف و ہراس پیدا کر رہے تھے، اور دوسری طرف انہیں اشتعال بھی دلا رہے تھے۔ ہندوستان کے اخبارات یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کے خلاف مظالم کی فرضی داستانیں بیان کر کے وہاں کے مسلمانوں کے خلاف انتقام کی آگ کو تیز سے تیز تر کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے لئے نہایت ضروری تھا کہ یہاں غیر مسلم اقلیتوں کو پورا پورا یقین دلایا جائے کہ وہ یہاں ہر طرح سے محفوظ رہیں گی اور مذہب کی بنا پر ان سے کوئی ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں قائدِ اعظمؒ کو پاکستان میں اپنی پہلی تقریر کرنی پڑی۔ قائدِ اعظمؒ بڑی متوازن شخصیت کے حامل تھے۔ وہ عام طور پر جذبات سے مغلوب نہیں ہوا کرتے تھے۔ لیکن جن حالات سے اُس وقت ملک دوچار تھا اور اتنی عظیم ذمہ داریوں کا بوجھ اس مملکت پر آ پڑا تھا، اس کے سربراہ کا ان سے متاثر ہو جانا کوئی غیر فطری امر نہیں تھا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وہ غیر مسلموں کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ انہیں یہاں اسی قسم کی حفاظت ملے گی جیسی مسلمانوں کو۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا تھا اس سے ان کا مقصد یہی تھا۔ لیکن (ہمیں اعتراف ہے کہ وہ اپنے معمول کے خلاف) شدتِ جذبات میں الفاظ کے انتخاب میں کما حقہٗ احتیاط نہ برت سکے۔ بایں ہمہ ان الفاظ سے یہ مستنبط کرنا کہ جس نظریہ کی رُو سے انہوں نے دس سال تک ہندو اور انگریز سے جنگ کر کے پاکستان حاصل کیا تھا وہ اسے پہلے ہی دن نذرِ آتش کر دیں گے، بڑی زیادتی ہے۔ کوئی باہوش انسان اسے باور نہیں کرے گا۔

آیئے ہم لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھیں کہ قائدِ اعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا مفہوم خود غیر مسلم اقلیتیں کیا سمجھتی تھیں۔ کیا انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ اس سے قائدِ اعظمؒ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت کا اعلان کر کے سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے۔ یا یہ کہ اس سے مقصود غیر مسلم اقلیتوں کا تحفظ تھا؟.... مسٹر جوشوا فضل الدین ایک مشہور مسیحی لیڈر تھے۔ (ان کا چند سال ادھر انتقال ہوا ہے) جب صدر ایوب (مرحوم) نے لا کمیشن کا تقرر کیا تو مسٹر جوشوا نے اس سوال پر بحث کی تھی کہ مجوزہ آئین کی بنیاد کیا ہونی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا (RATIONALE OF PAKISTAN CONSTITUTION) اس میں انہوں نے پہلے یہ واضح کیا تھا کہ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کی رُو سے مملکتِ پاکستان کے دو بنیادی ستون ہیں۔ یعنی:-

۱۔ مملکتِ پاکستان کی بنیاد مذہب پر ہوگی۔ یہی وہ قدرِ مشترک ہے جو مشرقی اور مغربی بازوؤں میں وحدت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔ اور
۲۔ اقلیتوں کے لئے تحفظات۔

اقلیتوں کے لئے تحفظات

اس کے بعد مسٹر جوشوا نے کہا تھا کہ مجوزہ آئین کو یہ دونوں شرائط پوری کرنی چاہئیں۔ اس کے بعد انہوں نے قائدِ اعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء اور اس کے ساتھ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کے اقتباسات دیکر یہ کہا تھا کہ ان کی تعبیر میں انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ کا مقصد یہ تھا کہ یہاں نہ ہندو، ہندو رہے، نہ مسلمان، مسلمان۔ بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک متحدہ قوم متشکل ہو، جس کا لازمی نتیجہ سیکولر اندازِ حکومت ہو جائے، وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مسٹر جوشوا نے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:۔

> یہ کہنا کہ تخلیقِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظمؒ نے ـــــ جو خود اس پاکستان کے خالق تھے ـــــ اپنی پہلی ہی تقریر میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے اس بات کا دور کا بھی امکان ہے کہ اس سے پاکستان کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی، بالکل پاگل پن ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے اتنا ہی کہا تھا کہ پاکستان میں بلا لحاظِ مذہب و ملت ہر ایک کو مساوی حقوق شہریت حاصل ہوں گے۔

اگست ۱۹۴۷ء کے بعد

اس کے بعد مجھے صرف اتنا اور کہنا ہے کہ اگر یہ تقریر قائدِ اعظمؒ کی زندگی کی آخری تقریر ہوتی تو پھر بھی اس مغالطہ آفرینی کی گنجائش نکل سکتی تھی کہ وہ جو کچھ دس سال تک کہتے رہے تھے، آخر میں وہ اس سے تائب ہو گئے تھے۔ اس لئے اب سند ان کی آخری تقریر ہی ہو سکتی ہے۔ حسنِ اتفاق کہ قائدِ اعظمؒ اس کے بعد بھی ایک سال تک زندہ رہے اور (اگرچہ ان کا یہ تمام عرصہ انتہائی نازک بیماری کے عالم میں گزرا لیکن بایں ہمہ) انہوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں پھر اس کی وضاحت کر دی کہ پاکستان کس قسم کی سٹیٹ ہو گی۔ انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں، اہلِ امریکہ کے نام جو پیغام براڈ کاسٹ کیا تھا۔ اس کا ایک حصہ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ انہوں نے اس کے شروع میں کہا تھا:۔

> مملکتِ پاکستان، جو دس کروڑ مسلمانوں کے حسین نصب العین کا ایک حد تک حصول ہے، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آ گئی تھی۔ یہ دنیا میں سب سے بڑی اسلامک سٹیٹ اور تمام دنیا کی مملکتوں میں پانچویں درجہ پر ہے۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل۔ ص۶۳)

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ محترم جسٹس منیر صاحب نے جس طرح اس براڈ کاسٹ کا وہ حصہ حذف کر دیا تھا جس میں قائدِ اعظمؒ نے بتایا تھا کہ مغیا کریسی کسے کہتے ہیں اسی طرح انہوں نے اس براڈ کاسٹ کا جو اقتباس

اپنی کتاب میں دیا ہے (صفحہ ۳۱-۳۰) اس میں اسلامک سٹیٹ کے الفاظ بھی درج نہیں کئے کیونکہ یہ اُن کے دعویٰ کی ساری عمارت کو منہدم کر دیتے تھے۔

انہوں اسی ماہ (فروری ۱۹۴۸ء میں) آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں فرمایا تھا:۔

مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان سے تقریباً ایک ہزار میل کے فاصلے پر ہے اور ان کے درمیان مملکتِ ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرونی ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال ابھرے گا وہ یہ ہوگا کہ (ایسی مملکت کا قیام) کس طرح ممکن ہوگا۔ ایسے دو خطوں میں، جن میں اس قدر بُعد ہو، وحدتِ حکومت کس طرح ممکن ہو گی۔ میں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں دونگا جو یہ ہے:۔

ایسا تمہارے ایمان کی رُو سے ہوگا۔ ایمان خدا پر۔ ایمان اپنے آپ پر۔ ایمان مستقبل پر۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ ایسے مختصر سے جواب کا پورا پورا مفہوم سمجھ نہ سکیں گے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بھی بیان کر دوں، اس کے بعد انہوں نے فرمایا:۔

پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے ارکان ہیں، جن میں حقوق، شرف و احترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنا بریں ہم میں اخوت اور وحدت کا بڑا گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات۔ ہم اپنے اسالیبِ فکر، نقطۂ نگاہ اور احساس دروں کے مالک ہیں اور یہی ہیں وہ عوامل جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتے ہیں۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل۔ صفحہ ۵۸)

اگر ہم مملکتِ پاکستان کی بنیاد قرآنِ مجید پر رکھتے اور اس کی تعلیم کو عام کرتے جاتے تو ہو نہیں سکتا تھا کہ مشرقی پاکستان علیحدہ ہو جاتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے قرآنِ کریم کے رشتہ سے اُمتِ واحدہ ہونے کے اصول و نظریہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور وطن اور نسل کی تفریق کے تصور کو عام ہونے دیا اس کا لازمی نتیجہ تشتت و افتراق تھا۔

"ایمان، ایمان خدا پر۔ ایمان اپنے آپ پر۔ ایمان اپنے مستقبل پر"۔ یہ تھی وہ اساسِ محکم جس پر مملکتِ پاکستان کی یہ رفیع و عظیم عمارت استوار ہوئی تھی۔ مجھے ایک بار پھر (بصد تاسف) کہنا پڑتا ہے کہ محترم منیر صاحب نے اپنی کتاب میں اس تقریر کا جو اقتباس دیا ہے (صفحہ ۳۱) اس میں وہ حصہ نقل نہیں کیا جس میں ایمان کا ذکر ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے ۱۴ اپریل ۱۹۴۸ء کو گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں ایک قبائلی جرگہ کے ساتھ گفتگو کے دوران فرمایا:۔

ہم مسلمان، ایک خدا، ایک کتاب (قرآنِ مجید) اور ایک رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں، اس لئے ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے صف بستہ کھڑے ہونا ہوگا۔ (تقاریر گورنر جنرل۔ صفحہ ۱۲۶)

انہوں نے ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء کو سبی دربار میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

میرے پیشِ نظر ہمیشہ اسلامی ڈیموکریسی کا اصول رہا ہے۔ یہ میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات کا راز ان سنہرے اصولوں کے اتباع میں ہے جنہیں ہمارے مقننِ اعظم حضور نبی کریم نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی ڈیموکریسی کی بنیاد حقیقی اسلامی نظریات اور اصولوں پر رکھنی چاہیئے۔

(تقاریر گورنر جنرل۔ صفحہ ۵۶)

تقسیم ہند کے عواقب میں، جب انگریز، ہندو اور سکھوں کی سازش نے ہمارے خلاف قیامت برپا کر دی تھی تو قوم شکستہ خاطر سی ہو رہی تھی۔ عین اس حالت میں آپ نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور میں تقریر کرتے ہوئے قوم کا حوصلہ بڑھایا اور کہا کہ یاد رکھو!-

ایسے نامساعد حالات میں بھی اگر ہم نے قرآن مجید سے بصیرت اور راہنمائی حاصل کی تو ہیں، ایک بار پھر یہ کہتا ہوں کہ آخر الامر فتح ہماری ہی ہوگی۔

(تقاریر گورنر جنرل۔ صفحہ ۳۰)

میں پوچھنا چاہتا ہوں ارباب بصیرت سے کہ ایک سیکولر سٹیٹ کا مدعی کیا اس قسم کے نظریات پیش کرے گا؟ اس موضوع پر کہنے کو تو ابھی بہت کچھ اور بھی ہے جا سکتا ہے اور میں گذشتہ تیس سال سے اس پر لکھتا چلا آ رہا ہوں ——— لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جانتے جانتے البتہ، ایک اور تاسف کا اظہار بھی ناگزیر ہے۔ محترم جسٹس فرماتے ہیں کہ

قائدِ اعظمؒ نے آئیڈیالوجی آف پاکستان (نظریۂ پاکستان) کے الفاظ کبھی استعمال نہیں کئے تھے۔

تشکیلِ پاکستان کے پندرہ سال بعد تک بھی کوئی شخص ان الفاظ سے واقف نہیں تھا۔ (صفحہ ۳۸)

قائدِ اعظمؒ پاکستان کے اسلامک سٹیٹ ہونے کے متعلق جو کچھ دس سال تک کہتے رہے اس کے بعد اس کی چنداں اہمیت نہیں رہتی کہ انہوں نے اس خاص اصطلاح نظریۂ پاکستان کو استعمال کیا تھا یا نہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ انہوں نے ان الفاظ کو بھی استعمال کیا تھا۔ مثلاً انہوں نے ایسوسی ایٹڈ پریس امریکہ کے نمائندہ کو ۸ نومبر ۱۹۴۵ء کو انٹرویو دیتے ہوئے جہاں یہ کہا کہ

پاکستان ایک مسلم سٹیٹ ہوگی۔

وہاں نظریۂ پاکستان (THEORY OF PAKISTAN) کے الفاظ بھی استعمال کئے تھے۔

(تقاریر قائدِ اعظمؒ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۲۷-۳۲۶)

پھر انہوں نے ۱۸ جون ۱۹۴۵ء کو فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے نام اپنے ایک پیغام میں کہا تھا۔

پاکستان سے صرف حریت اور آزادی مراد نہیں۔ اس سے فی الحقیقت مراد "مسلم آئیڈیالوجی" ہے جس کا تحفظ ضروری ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۶۳)

علاوہ ازیں انہوں نے اسلامک آئیڈیلز قسم کے الفاظ متعدد بار استعمال کئے تھے۔ باقی رہا تشکیلِ

پاکستان کے بعد پندرہ سال کا عرصہ، تو اگرچہ اس سوال کا قائداعظمؒ کی ذات سے کوئی تعلق نہیں لیکن اگر کوئی دیکھنا چاہے تو کم از کم طلوع اسلام کے فائل ہی دیکھ لے جن میں "اسلامی آئیڈیالوجی" (نظریۂ پاکستان) پر تفصیلی بحث موجود ہے۔

(۰)

جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں، ان تصریحات سے میرا مقصد اس نقصان کے ازالہ کی حسب استطاعت کوشش ہے جو پاکستان اور بانیٔ پاکستان کے خلاف اس قسم کے پروپیگنڈا کے ذریعے پہنچایا جا رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری یہ تنہا اور نحیف سی آواز اس شور و شغب کی کما حقہٗ حریف نہیں ہو سکتی جو اس مقصد کے لئے ملک کے گوشے گوشے میں برپا کیا جا رہا ہے۔ لیکن مجھے تو بہرحال اپنا فریضہ ادا کرنا ہے۔ یہ پراپیگنڈہ کتنے وسیع پیمانے پر عام کیا جا رہا ہے اس کا اندازہ ذیل کے ایک خط سے لگائیے جو حال ہی میں مجھے طلوع اسلام کے ایک قاری کی طرف سے موصول ہوا ہے:۔

ہفتہ وار الفتح کراچی۔ شمارہ ۸، ۲۶ستمبر (۱۸-۱۱) سنہ ۱۹۸۰ء میں ص۳۲ پر ایک مراسلہ زیر عنوان ——— قائداعظمؒ کیسا نظام حکومت چاہتے تھے ——— نظر سے گزرا۔ اس کی نقل بعینہٖ درج ذیل ہے:۔

ممتاز سیاسی رہنما عبدالرحمٰن صدیقی (مرحوم) ناقل ہیں کہ "تقسیم سے چند روز قبل نئی دہلی نمبر۱۰ اورنگ زیب روڈ کا واقعہ ہے کہ ڈنر کی میز پر راجہ صاحب (محمود آباد) نے قائداعظمؒ سے دریافت کیا۔ "پاکستان کا نظامِ حکومت کیا ہوگا؟" قائداعظمؒ نے پوچھا۔ آپ کے خیال میں کیا ہونا چاہیئے؟ راجہ صاحب نے جواب دیا۔ اسلامی اور ملت کا سب سے زیادہ دیندار، متقی، عالم باعمل، صالح ترین شخص کو ہمیشہ ملک کا سربراہ بنایا جائے"۔

قائداعظمؒ نے کہا۔ "تم بیسویں صدی میں قرونِ وسطیٰ کے حالات کا تصور کر رہے ہو۔ پاکستان میں سیکولر جمہوریت قائم ہوگی"۔

راجہ صاحب بولے "سر! میں نے اتنے برس مسلم لیگ کی جدوجہد محض ایک اسلامی مملکت اور اسلامی آئین کے نصب العین کو سامنے رکھ کر کی تھی"۔ "کون سے اسلام کا؟ اسلام میں بہتّر فرقے ہیں"۔ قائداعظمؒ نے دریافت کیا۔ راجہ صاحب خاموش ہوگئے۔

(کارِ جہاں دراز ہے۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۷۱-۲۷۲۔ از قرۃ العین حیدر)

اس وقت نہ عبدالرحمٰن صدیقی دنیا میں موجود ہیں، نہ راجہ صاحب محمود آباد، اور نہ قائداعظمؒ۔ محترمہ قرۃ العین حیدر بھارت فرار ہو چکی ہیں۔ اور وہاں جا کر انہوں نے لکھا تھا کہ وہ خود دو قومی نظریے پر یقین نہیں رکھتی تھیں۔ اب فرمائیے کہ ہمارے پاس ڈنر کے میز پر اس ٹیبل ٹاک کی تصدیق کا کونسا ذریعہ ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کو مسخ ہی اس قسم کی روایات کی رو سے کیا جاتا ہے۔ اسی لئے میں نے شروع میں کہا تھا کہ قائداعظمؒ (یا کسی اور) کی طرف اُن کی صرف ان باتوں کو منسوب کرنا چاہیئے جو ان کی زندگی میں محفوظ ہو گئی ہوں۔ اس قسم کی

وضعی روایات ہی نے تو ہمیں تباہ کیا ہے۔ مندرجہ بالا ایک روایت، ان تمام مجلدات کو غرقاب کر دینے کے لئے کافی ہے جو قائدِ اعظمؒ کی تقاریر، بیانات، خطابات، سے بھرپور ہیں۔ افسانہ ہمیشہ حقیقت سے زیادہ دلکش اور مؤثر ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید نے تیس پاروں میں اپنی جامع تعلیمات کو مکمل کرنے کے بعد، جن الفاظ پر اس کتاب عظیم کا اختتام کیا ہے، وہ وسوسہ انگیزی کے شر سے پناہ مانگنے کی دعا ہے۔ (مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۵ الْخَنَّاسِ ۵ سورۃ الناس) افسانے وسوسہ انگیزی کا بڑا کامیاب حربہ ہوتے ہیں۔ ان سے افراد نہیں قوموں کی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ پاکستان کو تباہ کرنے کے لئے بتیس سال سے افسانہ طرازی کی یہ کوششیں جاری ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ پاکستان ہندوؤں کی تنگ نظری کی وجہ سے وجود میں آیا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کے محرکات سب معاشی تھے۔ کراچی کے ایک پروفیسر قمر الدین خان صاحب دس قدم آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں اسلامی مملکت یا سیاسی نظام کا اشارہ تک نہیں ملتا۔ اور انبیاء کرامؑ صرف پرستش کے طور طریقے سکھانے کے لئے آیا کرتے تھے۔ انہوں نے سرے سے ٹنٹا ہی ختم کر دیا۔ (ان کا یہ مقالہ روزنامہ "ڈان" کے اس ضمیمہ میں چھپا تھا جو اگست سنہ ۱۹۸۰ء کے یوم آزادی کی تقریب پر شائع ہوا تھا) انہوں نے سارا قصہ ہی ختم کر دیا۔

یہ ہے وہ پراپیگنڈہ جو آج کل بڑی شدومد سے جاری ہے۔ ہم اس باب میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ اس خطۂ زمین کو اپنی حفاظت میں رکھے جسے ہم نے "مسجد" تعمیر کرنے کے لئے حاصل کیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس پر ابھی تک "مسجد" تعمیر نہیں ہو سکی۔ اور جنہوں نے اس کی تعمیر کے لئے اس خطہ کے حصول کے لئے تگ و تاز کی تھی، (اور ان میں سے جو اس کے غبارِ کارواں کی طرح "ہنوز زندہ ہیں") وہ اپنے اسی حسین خواب کی تعبیر کے انتظار کے سہارے جی رہے ہیں۔ لیکن اگر (خدا نہ کرے) یہ خطۂ زمین ہی محفوظ نہ رہا تو "تعمیرِ مسجد" کا امکان ہی ختم ہو جائے گا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری! اور یہی ان پاکستان دشمن کوششوں کا مقصود ہے۔

(۰)

یہاں تک میرا یہ مقالہ روزنامہ "نوائے وقت" کی اشاعت بابت ۱۷ر اکتوبر سنہ ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اس میں یہ عبارت تھی:-

> آخر میں ایک درخواست جسٹس محمد منیر صاحب سے بھی ہے۔ یوں تو زندگی خدا کی دین ہے اور وہ جس وقت چاہے اٹھا لے تاہم انسان کی ایک عمرِ طبعی بھی ہوتی ہے۔ نہایت دلسوزی سے عرض ہے کہ جسٹس صاحب جن کی عمرِ طبعی پورے طور گزر چکی ہے اور وہ کسی بھی وقت خدا کے حضور میں پیش ہو سکتے ہیں، اگر مناسب سمجھیں تو اپنی اس غلطی کا ازالہ کر سکتے ہیں اور اسے اپنی انا کا مسئلہ نہ بنائیں تو پاکستان کے محرکات کے بارے میں اپنی ذاتی سوچ سے کنارہ کش ہو سکتے ہیں۔ توبہ کا دروازہ ابھی کھلا ہے مگر کسی بھی وقت ان کے لئے بھی اور ہمارے لئے بھی بند ہو سکتا ہے۔

میں اس کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ الفاظ میرے نہیں۔ نوائے وقت نے میرے علم اور اطلاع

کے بغیر یہ اضافہ اپنی طرف سے کر دیا اور اس کی تصریح بھی نہیں کی۔۔۔ یہ آدابِ صحافت کے خلاف تھا۔ محترم منیر صاحب اگر سیکولر سٹیٹ کے حق میں ہیں تو یہ ان کا ذاتی خیال ہے۔ مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ میں اتنا ہی کہوں گا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ میرا اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اس خیال کو قائداعظمؒ کی طرف منسوب کیا ہے، جو حقیقت کے خلاف ہے۔ میرا مقصد ان کے اس الزام کی تردید اور احقاقِ حق تھا جسے میں اپنا فریضہ سمجھتا ہوں۔ تحریکِ پاکستان کے دوران بھی یہ موضوع زیرِ بحث رہا تھا۔ وہاں نیشنلسٹ علماء کا گروہ تھا جس کا دعویٰ یہ تھا کہ سیکولر سٹیٹ عین مطابق اسلام ہے۔ میں نے اسلامی نقطۂ نگاہ سے ان کی مخالفت کی اور قرآنی دلائل اور صدرِ اسلام کے شواہد سے ثابت کیا کہ سیکولرازم اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یعنی ان حضرات کی طرف سے اسلام کے خلاف جو الزام عائد کیا جاتا تھا میں نے اس کی تردید کی تھی۔ اور اسے میں اپنا فریضہ سمجھتا تھا، اور آج بھی اپنا فریضہ سمجھتا ہوں (اور اس کی سزا بھی بھگت رہا ہوں) میں نے جو کچھ ۱۹۳۸ء میں کہا تھا، ۱۹۸۰ء میں بھی وہی کہتا ہوں کیونکہ یہ قرآنی حقائق پر مبنی ہے، اور قرآنی حقائق ابدی، اور غیر متبدل ہیں ــــــ قرآن کو سند اور حجت ماننے والے کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ آج کچھ کہہ دے اور کل کچھ اور۔ قرآن کا متبع نہ مداہنت کر سکتا ہے نہ کسی سے مفاہمت۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق ‏‏‏ نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش ‏‏‏ میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند (بالِ جبریل)

ــــــــ (۵) ــــــــ

نوائے وقت میں میرا مقالہ شائع ہونے کے بعد، مجھے، ملک اور بیرونِ ملک کے دور دراز گوشوں سے خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ جن حقائق کا میں نے انکشاف کیا ہے وہ ان کے علم میں پہلی مرتبہ آئے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ملک کے ذرائع ابلاغ (پریس) نے میرے خیالات کے گرد جو حصار کھینچ رکھا ہے، اس مقالہ کی نوائے وقت میں اشاعت سے اس میں شگاف پڑا اور اس طرح میرے خیالات، طلوعِ اسلام کے حلقہ سے باہر، دور دراز خطوں تک پہنچ گئے۔ اس کے لئے میں، نوائے وقت، کا بھی شکر گذار ہوں اور جن حضرات کی طرف سے مجھے یہ خطوط موصول ہوئے ہیں، ان کا بھی۔ ان خطوط میں ایک مطالبہ بطور قدرِ مشترک سامنے آتا ہے۔ ان میں کہا گیا ہے کہ میں ذرا وضاحت سے بتاؤں کہ تھیاکریسی۔ سیکولرازم اور اسلامی مملکت میں کیا فرق ہے؟ میں ان موضوعات پر (پاکستان میں) گذشتہ تیس سال سے لکھتا چلا آرہا ہوں لیکن چونکہ یہ مطالبہ ان گوشوں سے موصول ہوا ہے جن تک (غالباً) اس سے پہلے میرے خیالات نہیں پہنچے اس لئے

میں مختصر الفاظ میں اس کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

تھیاکریسی کا تصور تو پرانا ہے لیکن اسے بطور نظامِ حکومت، عیسائی کلیسا (چرچ) نے یورپ میں رائج کیا۔ عیسائیت میں حکومت کا تصور تک نہیں۔ نہ ہی (مروّجہ) انجیل میں قوانین دیئے گئے ہیں۔ اس لئے عیسائی پادریوں کی حیثیت مشنریوں (مبلغین) سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ جب بعض بادشاہوں نے عیسائیت قبول کی تو پادریوں کے دل میں بھی جذبۂ اقتدار پرستی نے انگڑائی لی۔ انہوں نے بادشاہوں سے سمجھوتا کیا کہ احکام و قوانین کلیسا (چرچ) وضع کرے لیکن وہ، نافذ حکومت کی طرف سے ہوں۔ اور یہ سارا کاروبار خدا کے نام پر ہو۔ یعنی ان احکام و قوانین کو احکامِ خداوندی کہہ کر پکارا جائے اور انہیں نافذ کرنے والے حکمرانوں کو شریعتِ خداوندی کے محافظ قرار دیا جائے۔ اس سے ایک طرف، مذہبی پیشوائیت کے جذبۂ اقتدار کی تسکین کا سامان فراہم ہو گیا اور دوسری طرف، حکمرانوں کو مقبولیتِ عامہ حاصل ہو گئی، کیونکہ عوام مذہب پرست تھے اور مذہب کے محافظ ان کے نزدیک خدائی اختیارات اور الوہیاتی احترام و تقدیس کے حامل (انگلستان کے بادشاہ یا ملکہ کو آج تک (DEFENDER OF THE FAITH) کہہ کر پکارا جاتا ہے) — مذہب اور حکومت کی اس ملی بھگت کو تھیاکریسی (یعنی حکومتِ خداوندی) سے تعبیر کیا گیا۔ اس نظامِ حکومت میں انسانیت ظلم و استبداد کے جس جہنم میں مبتلا رہی، اس کے تصور تک سے (ہمارا آپ کا ہی نہیں) ہلاکو اور چنگیز خاں تک کا کلیجہ دہل جاتا ہے۔ نوعِ انسان کی تاریخ میں، تھیاکریسی سے بدتر دور کبھی نہیں آیا۔ ہلاکو اور چنگیز خاں کے دل میں شاید کبھی کھٹک پیدا ہو جاتی ہو کہ ہم بے گناہوں پر کیوں ظلم کر رہے ہیں۔ لیکن جو ظلم و تشدد خدا کے نام پر برپا کیا جائے اس سے تو ظالم اور مستبد حکمران اطمینان ہی نہیں، فخر محسوس کرتا ہے کہ میں خدائی مشن پورا کر رہا ہوں۔

مختصر الفاظ میں تھیاکریسی سے مراد ہے ایسا نظامِ حکومت جس میں انسانوں کے وضع کردہ احکام و قوانین کو احکامِ خداوندی کہہ کر نافذ کیا جائے اور ان کی مخالفت کرنے والوں کو مرتد قرار دے کر حوالۂ دار و رسن کر دیا جائے۔ ان مظالم کی بنا پر تھیاکریسی کے خلاف جو ردِ عمل ہوا اسے سیکولرازم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نظام کے حامیوں نے کہا کہ مذہب کو مملکت اور حکومت سے کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب کا دائرہ، گرجا کی چار دیواری تک محدود ہے۔ مملکت کے معاملات، قوم کی منشاء کے مطابق، کسی قسم کی حدود و قیود کے بغیر، آزادانہ طے پائیں گے۔ انہوں نے مذہب کے لبادہ کے ساتھ، اخلاقی اقدار و اصول کی "صدری" کو بھی اتار کر دور پھینک دیا۔ یہ ہے سیکولر نظامِ حکومت جس میں قانون سازی کے کلی اختیارات، کسی قسم کی حدود و شرائط کے بغیر، قوم (انسانوں) کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ نظامِ حکومت (کم و بیش) ساری دنیا میں رائج ہے۔ (اور ساری دنیا اس کے ہاتھوں نالاں بھی ہے)۔

جب انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی تو انہوں نے دیکھا کہ اس ملک کے باشندے سخت قسم کے مذہب پرست واقعہ ہوئے ہیں۔ اس بنا پر انہوں نے سوچا کہ یہاں یورپ کی شکل کی سیکولرازم چل نہیں سکے گی۔ انہوں نے اس میں یہ ترمیم کی کہ قوانین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) اور دوسرے، ملکی قوانین (PUBLIC LAWS) انہوں نے کہا کہ شخصی قوانین کی حد تک

ہر شخص کو آزادی ہوگی کہ وہ اپنے عقیدہ اور مسلک کے مطابق ان کا اتباع کرے۔ لیکن پبلک لاز میں مذہب کو کوئی دخل نہیں ہوگا۔ یعنی انہوں نے، پرسنل لاز کی حد تک، تھیاکریسی رائج کر دی اور پبلک لاز کے لئے سیکولرازم۔ ہمارے مذہب پرست طبقہ نے اسے مذہبی آزادی سے تعبیر کیا اور اس کے لئے سلطنتِ انگلشیہ کا بے حد شکر گذار ہوا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، یہی مؤقف (ہندوؤں اور) نیشنلسٹ علماء کا تھا۔ اور اسی کو ساتھ لے کر وہ پاکستان آئے۔ ان کے برعکس، اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ نے اسلامی مملکت کا تصور اور مطالبہ پیش کیا۔

اسلامی مملکت میں حقِ حکومت نہ مذہبی پیشوائیت کو حاصل ہوتا ہے نہ ملک کے دیگر باشندوں کو۔ یعنی وہ تھیاکریسی۔ سیکولرازم۔ یا انگریزوں کی وضع کردہ تھیاکریسی + سیکولرازم، سب کے خلاف ہوتی ہے۔ اس میں حقِ حکومت خدا کی کتاب (قرآنِ مجید) کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں وہ اصول اور اقدار دیئے گئے ہیں جو ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ مملکت کا فریضہ ان اصول و اقدار کو نافذ کرنا ہوتا ہے۔ ان کی تنفیذ کے طور طریقے قوم (اُمت) کے باہمی مشورہ سے طے کئے جاتے ہیں۔ انہیں آپ جزئی قوانین کہہ لیجئے۔ شرط اس میں بھی یہ ہوتی ہے کہ یہ قرآن کے کسی اصول و اقدار سے ٹکرائیں نہیں۔ ان میں پبلک لاز اور پرسنل لاز کی کوئی تفریق اور تمیز نہیں ہوتی۔ پبلک لاز کی طرح ان سب کا اطلاق ملک کے تمام مسلم باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ یہ قوانین زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے اور قرآنی اصول و اقدار (جنہیں حدود اللہ کہہ لیجئے) ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ اس مشاورت کی عملی شکل کیا ہوگی، اسے بھی اُمت، باہمی مشورہ سے (مندرجہ بالا شرط کے تحت) خود طے کرے گی۔

یہ ہیں اسلامی مملکت کے نمایاں خط و خال۔ قرآنِ کریم نے بہ نصِ صریح کہہ دیا ہے کہ اس کے سوا جو نظامِ حکومت بھی ہے، وہ کافرانہ نظام ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی کافر ہیں۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ جو چیز اسلامی نظامِ مملکت کو غیر اسلامی نظام سے ممیز اور ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں قانون سازی کے اختیارات ان اصول و اقدارِ خداوندی سے مشروط اور ان کے تابع ہوتے ہیں جنہیں حدود اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ حدود منزل من اللہ ہوتے ہیں، ابدی اور غیر متبدل۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو متعدد مقامات میں دہرایا ہے۔ سورۃ الانعام میں ہے: "تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ..." (۶/۱۱۶) "تیرے رب کے اصول و قوانین صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ اب ان میں کوئی اختیاری تبدیلی نہیں کر سکتا۔" (نیز ۶/۳۴ و ۱۸/۲۷)۔ سورۃ یونس میں ہے: "لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ" (۱۰/۶۴) "قوانین و حدودِ خداوندی میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔" اس کے برعکس دنیا کے ہر نظام میں (خواہ وہ ملوکیت ہو، خواہ آمریت اور خواہ مغرب کی جمہوریت) قانون سازی کے اختیارات پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی۔ یہی بنیادی تخصیص، اسلامی اور غیر اسلامی نظام میں مابہ الامتیاز ہے (سیکولر نظام کے حامیوں کی طرح) جسٹس منیر صاحب، غیر متبدل اصول و حدود کو نہیں مانتے۔ ۱۸ جنوری ۱۹۷۵ء کے پاکستان ٹائمز میں ان کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا:۔

قانونِ تغیر ایک فطری اصول ہے جو تمام کائنات کو محیط ہے۔ ایک ذرۂ ناچیز سے لے کر بڑے سے بڑے کرۂ فلک تک، حرکت اور تغیر کی حالت میں مستقلاً سرگرداں ہیں۔ ہم بھی، جو اس عظیم کائنات کے ایک ذرہ سے گوشے کے مکین ہیں، اسی

قانونِ تغیر کے زیرِ اقتدار زندگی بسر کرتے ہیں۔ (ہمارے) اس بیان کی صداقت کے لئے آپ گذشتہ تاریخ پر نگاہ ڈالیے۔ شیکسپیئر نے کہا تھا "خیر اور شر فی ذاتہٖ کچھ نہیں۔ یہ ہمارا زاویۂ نگاہ ہے جو کسی بات کو خیر قرار دیتا ہے، کسی کو شر۔ (جیسا ہم خیال کریں وہ شے ویسی ہی ہو جاتی ہے)۔ حق اور باطل، غلط اور صحیح ——— قانونی نہیں بلکہ اخلاقی نقطۂ نگاہ سے ——— اضافی ہیں۔ اسی طرح خیر اور شر بھی۔ انسان کا تصورِ حق و باطل اور خیر و شر سوسائٹی کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ جیسے اس بات کا فیصلہ کہ فحش اور بے حیائی کیا ہے، سوسائٹی کے معیار کی رُو سے ہوتا ہے۔ انسان اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے جو ہمیشہ بدلتا رہتا ہے ——— بجز اس کے کہ کوئی بڑی مہیب قوت اسے روک کے رکھے ——— اور جس سوسائٹی اور مملکت میں انسان زندگی بسر کرتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تغیرات کو نگاہ میں رکھے۔ مذہب پرست طبقہ البتہ غیر متبدل اقدار پر ایمان رکھتا ہے۔

طلوعِ اسلام نے اپنی اشاعت بابت مارچ ۱۹۷۷ء میں اس پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا تھا۔

"یہ خیالات اسلام کے پیش کردہ تصورِ حیات کو کس طرح جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتے ہیں، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ہم اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ (اسلام تو ایک طرف) نظامِ فطرت کے متعلق بھی محترم مقالہ نگار کی معلومات بھی بڑی سطحی اور ناقص ہیں۔ وہ اگر کسی عام سائنس دان سے بھی پوچھ لیتے تو وہ بتا دیتا کہ یہ کارگہ کائنات، فطرت کے غیر متبدل قوانین کے تابع سرگرمِ عمل ہے، اور تغیرات صرف ان قوانین کے مظاہر ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ خزاں کے موسم میں درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ سرما میں وہ بالکل ٹھنڈ منڈ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر بہار آتی ہے تو ان میں شگفتہ و شاداب تازہ پتیاں اُبھرتی ہیں۔ غنچے چٹکتے ہیں۔ پھول کھلتے ہیں۔ پھل آتے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک غیر متبدل قانونِ نشو و نما کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر ان قوانینِ فطرت میں، جس کی بنیادوں پر اس محیر العقول کارگہ کائنات کی عمارت استوار ہے، ذرا سا تغیر بھی آ جائے تو سارا سلسلہ کائنات تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ خود منیر صاحب اپنی طبیعی زندگی پر غور فرمائیں۔ زندگی کا مدار تنفس (سانس لینے) کے قانون پر ہے۔ کیا ان کی ساری عمر میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس قانونِ حیات میں تغیر واقع ہوا ہے؟ وہ غالباً اسے "تغیر" سمجھتے ہیں کہ عام حالات میں انسان از خود فضا میں سانس لیتا ہے۔ سمندر کی تہ میں، یا چاند کی سطح پر، اسے آکسیجن کا بیگ اپنی کمر پر لادنا پڑتا ہے، اور مریض کو آکسیجن ٹینٹ میں رکھتے ہیں۔ لیکن یہ قانونِ زندگی کے تغیرات نہیں۔ یہ اس قانون پر عمل پیرا ہونے کے ذرائع و اسباب ہیں۔ ذرائع و اسباب حالات کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ قانون ہمیشہ غیر متبدل رہے گا ——— یہ ہے نظامِ فطرت۔

انسان کی تمدنی زندگی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس کے لئے بھی قوانین کی ضرورت ہے۔ یہ قوانین (جو وحی کے ذریعے عطا ہوتے ہیں) غیر متبدل رہتے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونے کے اسباب و ذرائع بدلتے رہتے ہیں۔ یہ غیر متبدل قوانین خیر و شر اور حق و باطل کا معیار ہیں۔ منیر صاحب اپنے دعویٰ کی تائید میں شیکسپیئر کا قول پیش کرتے ہیں، اور اس کے برعکس، اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ لَا تَبۡدِيۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ قوانینِ خداوندی غیر متبدل ہیں۔ "مذہب پرستوں" کا خدا کے اس ارشاد پر ایمان ہے جس کی تائید کائنات کا سارا نظامِ فطرت کر رہا ہے۔

لیکن ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ منیر صاحب اپنے دعویٰ کی تائید میں، علامہ اقبالؒ کو بھی پیش فرما رہے ہیں۔ لیکن اسی طرح جس طرح انہوں نے نظامِ فطرت کو اپنی تائید میں پیش کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے مندرجہ بالا دعوے کے بعد خطباتِ اقبالؒ

سے حسبِ ذیل اقتباس پیش کرتے ہیں:-

> اسلام کا پیش کردہ تصوّر یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصوّر پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں — وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے، تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلّب بن کر رہ جائے گی۔

منیر صاحب نے اپنے اس دعویٰ کی تائید میں (کہ انسان کی تمدنی زندگی میں غیر متبدل کا کوئی تصوّر نہیں) علامہ اقبالؒ کا مندرجہ بالا بیان پیش فرمایا ہے۔ اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے کہ

سخن شناس نہ ای، دلبرا! خطا اینجاست

جس طرح وہ نظامِ فطرت کے متعلق اتنا نہیں سمجھ سکے تھے کہ اس میں کس قدر غیر متبدل قوانین کارفرما ہیں، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکے کہ اقبالؒ کا بیان ان کی تائید نہیں کر رہا، تردید کر رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ، ثبات و تغیر کے امتزاج کو اصولِ حیات قرار دے رہے ہیں۔ وہ غیر متبدل قوانین کو وہ سہارا قرار دیتے ہیں جس پر انسانی زندگی کا قیام ہے لیکن جس طرح محترم جسٹس منیر نے قائدِ اعظمؒ کے بیانات نقل کرتے ہوئے، ان کے ان حصّوں کو حذف کر دیا تھا جو ان کے خلاف جاتے تھے، اسی طرح انہوں نے خطباتِ اقبالؒ میں سے صرف مندرجہ بالا اقتباس درج کیا تھا اور اس سے اگلی سطریں حذف کر دی تھیں کیونکہ وہ بدیہی طور پر ان کے مسلک کی تردید کرتی تھیں۔ علامہ نے لکھا تھا:-

> یورپ کو اپنی عمرانی اور سیاسی زندگی میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں، اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظرانداز کر رکھا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے اس بیان میں سیکولرازم اور تھیاکریسی دونوں کا ابطال کر دیا ہے۔ سیکولرازم کا یہ کہہ کر کہ یورپ کی تباہی کا سبب یہ ہے کہ ان کے پاس غیر متبدل اصولِ حیات نہیں، اور تھیاکریسی کا یہ کہہ کر کہ مسلمانوں نے صدیوں پہلے کے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدل قرار دے کر انہیں مقامِ الوہیت عطا کر رکھا ہے۔ یہ دونوں مسالک خلافِ اسلام ہیں اور قوموں کی تباہی کا موجب۔

جسٹس منیر نے سیکولرازم کے اپنے عقیدہ کی تائید میں پہلے قائدِ اعظمؒ کا سہارا لینا چاہا اور اس میں ناکام رہے۔ پھر علامہ اقبالؒ کو ساتھ ملانا چاہا تو وہ بھی جواب دے گئے۔ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ يُضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ (۱۶/۳۷) جو خدا کی راہ نمائی کو چھوڑ کر غلط روش اختیار کر لے، اسے کوئی حامی و ناصر نہیں مل سکتا۔

والسلام

ادارہ طلوعِ اسلام نے اشرف پرنٹنگ پریس، لاہور سے چھپوا کر گلبرگ ۲ لاہور سے شائع کیا۔